انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

حیاتِ نو

جولائی تا ستمبر ۲۰۱۲ء

مدیر: انیس احمد مدنی

مجلس ادارت:

مشرف حسین صدیقی فلاحی	دہلی
مقبول احمد فلاحی	لکھنؤ
ڈاکٹر عبدالباری فلاحی	دہلی
مولانا محمد اسماعیل فلاحی	جامعۃ الفلاح

فی شمارہ	: اندرون ملک	۳۰/روپئے
	بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون	: اندرون ملک	۱۲۰/روپئے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ	: اندرون ملک	۳۰۰۰/روپئے
	بیرون ملک	۲۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

نمائندے

لندن	: رضوان احمد فلاحی
دہلی	: نعیم احمد غازی فلاحی
علی گڑھ	: ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
ممبئی	: حافظ ادہم علی فلاحی
نیپال	: نذرالحسن فلاحی
یو۔اے۔ای۔	: خالد حسن رشید فلاحی
قطر	: محمد اکرم فلاحی
کویت	: محمد سموئیل فلاحی
سعودی عرب	: انعام اللہ فلاحی

خط وکتابت کے پتے

- برائے ادارتی امور
انیس احمد مدنی، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج
اعظم گڑھ (یوپی)

- برائے انتظامی امور وترسیل زر
عرفان احمد فلاحی جامعۃ الفلاح، بلریا گنج
اعظم گڑھ (یوپی)-276121
موبائل: +91-9453757380
ای میل: hayatenau123@gmail.com

Composed by: **Mohd. Abuzar Azmi**
Azamgarh, Mob.: 9580147500

Layout Designing & Title Designing: **sajidkhalil**@gmail.com
Cell: +919999828273

نقوشِ حیاتِ نو

اداریہ		
ماہِ رمضان المبارک کیسے گزاریں	ادارہ	۳
عظمت کے مینار		
ابو مسلم خولانیؒ	افتخار الحسن مظہری ندوی	۶
روشنی کا سفر		
الفونس کا قبول اسلام	ابوذر اعظمی	۸
بحث و نظر		
تفہیم القرآن-ایک مطالعہ (۳)	مولانا محمد اسماعیل فلاحی	۱۱
ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری اور ان کی تالیف 'السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ' کا ایک مطالعہ (۱)	محمد صلاح الدین عمری	۲۵
مقالات		
قرآنی اسالیب دعوت (۷)	مولانا مقبول احمد فلاحی	۳۴
قوم یہود اور امن عالم (۱)	فریدالدین فلاحی	۳۹
اسلام کا نظریۂ طب وعلاج (۱)	ولی اللہ مجید قاسمی	۴۷
عظمت رفتہ		
روزمرہ کے مسائل میں سلف صالحین کی احتیاط	حیات اللہ نعیم قاسمی	۶۴
قابل تقلید اسوہ		
ایک انوکھا مقدمہ	ادارہ	۶۸
مذاہب عالم		
مجوسیت اور زرتشتیت	ابوارقم فلاحی	۷۰
تعارف وتبصرہ		
ایمانی تقریریں: شیخ شفیق احمد قاسمی	اخلاق احمد کریمی قاسمی	۷۱
جامعہ کے لیل و نہار	عبدالرقیب فلاحی	۷۲
جمعیۃ الطلبہ کی سرگرمیاں		۷۳
کلیۃ البنات کے شب وروز		۷۵
رودادِ انجمن	رپورٹ قطر یونٹ	۷۹

ماہِ رمضان المبارک کیسے گزاریں

رمضان المباک کا مہینہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی بڑی عظیم نعمت ہے، البتہ اس نعمت کی قدر و قیمت وہی لوگ ہی محسوس کر سکتے ہیں جن کو اللہ پاک نے اپنے فضل سے نوازا ہوا اور جن کو اس ماہِ مبارک میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والی انوار و برکات کی بارش کی معرفت حاصل ہو۔

اللہ کے رسول ﷺ جب ماہِ رجب کا چاند دیکھتے تو یہ دعا فرماتے: اللھم بارك لنا فی رجب و شعبان و بلغنا الیٰ رمضان اے اللہ ہمارے لیے رجب اور شعبان کے مہینوں میں برکت عطا فرما اور ہمیں رمضان کے مہینے تک پہونچا دے یعنی ہماری عمر اتنی دراز کر دے کہ ہمیں رمضان کا مہینہ نصیب ہو جائے، گویا اللہ کے رسول ﷺ کے اندر دو ماہ قبل ہی سے رمضان کا انتظار اور اشتیاق پیدا ہو جاتا اس سے رمضان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

رمضان کا یہ مبارک مہینہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے قرب حاصل کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے، عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رمضان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ روزوں کا مہینہ ہے، اس میں روزے رکھے جائیں گے، تراویح کی نماز ادا کی جائے گی اور بس، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بات یہیں تک ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ ساری عبادتیں ایک بڑی چیز کی علامت ہیں اور وہ یہ کہ یہ ماہ خاص اللہ تعالیٰ کا مہینہ ہے۔ اس نے یہ مہینہ اپنے بندوں کو اس لیے عطا فرمایا ہے تا کہ گیارہ مہینے تک مال و دولت کے حصول، دنیوی کاروبار میں الجھے رہنے، خواب غفلت میں پڑے رہنے اور بہت حد تک اللہ تعالیٰ سے دور رہنے کے بعد بندے اللہ کا قرب حاصل کر سکیں، گیارہ مہینوں کے اندر ان کی روحانیت میں جو کمی آ گئی ہے اس کا ازالہ کر سکیں، دلوں پر جو زنگ لگ گیا ہے اسے دور کر سکیں، اللہ تعالیٰ سے تعلق میں جو کمزوری آ گئی ہے اسے ختم کر سکیں۔

انہی عظیم مقاصد کے حصول کے لیے اللہ پاک نے اس مہینہ میں روزہ فرض فرمایا ہے جو قرب خداوندی پیدا کرنے کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

یـایھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم

لعلکم تتقون (البقرۃ:۱۸۳) اے ایمان والو! تم پر روزے اسی طرح فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تا کہ تمہارے اندر تقویٰ و پرہیزگاری پیدا ہو جائے۔

روزہ اس ماہِ مبارک کی خاص عبادت ہے جو اسلام کے ارکان خمسہ میں سے ایک اہم رکن ہے، اس کی فضیلت میں بے شمار حدیثیں وارد ہوئی ہیں ان میں سے ایک حدیث ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ان الفاظ میں مروی ہے۔

قال رسول الله ﷺ ان ربکم یقول: کل حسنة بعشر أمثالها الی سبعمائة ضعف الا الصوم فانه لی وانا اجزی به والصوم جنة من النار ولخلوف فم الصائم أطیب عند الله من ریح المسك وان جهل علی أحدکم جاهل و هو صائم فلیقل انی صائم (ترمذی شریف، باب ماجاء فی فضل الصوم) اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارے رب کا ارشاد ہے کہ ہر نیکی کا بدلہ دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک دیا جائے گا سوائے روزہ کے تو وہ میرے لیے ہے، میں ہی اس کا بدلہ دوں گا، روزہ جہنم سے بچاؤ کے لیے ایک ڈھال ہے، روزہ دار کے منہ کی بدبو اللہ کے نزدیک مشک سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے، اگر کوئی شخص کسی روزہ دار کے ساتھ جہالت سے پیش آئے تو وہ کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔

روزہ کے علاوہ دیگر عبادات جو اس ماہ میں مشروع کی گئی ہیں وہ بھی قرب خداوندی کے حصول کے اہم ذرائع ہیں۔

ماہ رمضان کے مقاصد کی حصولیابی کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس مہینے کو منصوبہ بند طریقے سے زیادہ سے زیادہ عبادات کے لیے فارغ کر لیا جائے، اپنے روزمرہ کے کاموں مثلاً تجارت، ملازمت، زراعت وغیرہ میں سے جن کاموں کو مؤخر کیا جا سکتا ہو ان کو مؤخر کیا جائے، اپنے اوقات اس انداز سے منظم کیے جائیں کہ زیادہ سے زیادہ وقت عبادات میں صرف کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل طریقے اختیار کیے جائیں۔

۱- اس ماہ مبارک کو کلام الٰہی سے خاص مناسبت ہے، چنانچہ تمام آسمانی کتابیں اور صحیفے اسی ماہ میں نازل کیے گئے، خود قرآن پاک بھی اسی ماہ کی شب قدر میں نازل ہوا۔ ارشاد خداوندی ہے: شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن (البقرہ) رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، دوسرے مقام پر ارشاد ہے: انـا انـزلـنـاه فی لیلة القدر (القدر) کہ ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا۔ اس لیے اس مہینے میں قرآن کریم کی تلاوت کا خاص اہتمام کیا جائے،

قرآن پاک سے زندہ تعلق اور وابستگی قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔قرآن فہمی اور تدبر وتفکر پر بھر پور توجہ دی جائے۔

۲- دوسرے ایام میں عام طور پر جن نوافل کی ادائیگی کی توفیق نہیں ملتی ان کو رمضان میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے مثلاً تہجد، اشراق، چاشت، اوابین کے نوافل کا اہتمام کیا جائے۔

۳- اس ماہ میں زکوۃ کے علاوہ نفلی صدقات بھی زیادہ سے زیادہ دینے کی کوشش کی جائے بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق آنحضورﷺ کی سخاوت کا دریا ویسے تو پورے سال ہی موجزن رہتا لیکن رمضان میں آپ کی سخاوت ایسی ہوتی تھی جیسے جھونکے مارتی ہوئی ہوائیں چلتی ہیں۔

۴- چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کیا جائے، کلمۂ طیبہ اور کلمۂ استغفار کا خوب اہتمام کیا جائے۔

۵- ہر طرح کے گناہوں سے بچنے کی بھر پور کوشش کی جائے، قلب ونظر کی بھر پور حفاظت کی جائے۔جھوٹ، غیبت، چغل خوری، دل آزاری، فضول کاموں، فضول مجلسوں اور فضول باتوں سے بالکلیہ اجتناب کیا جائے۔

۶- اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی کثرت کی جائے۔اس مہینے میں رحمت کے سارے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، فضل وانعام کی گھٹائیں جھوم جھوم کر برستی ہیں، مغفرت کے لیے بہانے ڈھونڈے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز دی جاتی ہے کہ ’’ہے کوئی مانگنے والا جس کی مانگ میں پوری کروں۔‘‘ صبح کا وقت ہو یا شام کا، دن کا وقت ہو یا رات، افطار کا وقت ہو یا سحری کھانے کا، ہر وقت دعا کی قبولیت کے دروازے کھلے ہوتے ہیں، اس لیے خوب خوب دعا کی جائے۔اپنے لیے، اپنے اعزہ واقارب کے لیے، اپنے متعلقین کے لیے، اپنے ملک وملت کے لیے پورے عالم اسلام کے لیے گریہ وزاری کے ساتھ دعا کی جائے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رحمت سے اس ماہ مبارک کی قدر کرنے اور اس کے اوقات کو اس طرح استعمال کرنے کی توفیق عنایت فرمائے کہ اس کے مقاصد کلی طور پر حاصل ہوسکیں۔آمین

☆☆☆

ابومسلم خولانیؒ

افتخار الحسن مظہری☆

تابعین کے سرخیل ابومسلم خولانیؒ اپنے عہد کے نامور عابد وزاہد تھے۔زمانہ نبویؐ میں ہی مشرف بہ اسلام ہوئے لیکن مدینہ نہ پہنچ سکے۔اس لیے شرفِ صحابیت سے محروم رہے۔جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا زمانہ آیا تو مدینہ پہنچے اور متعدد صحابہ سے احادیث کا درس لیا۔حضرات عمر، معاذ، ابوعبیدہ، ابوذر اور عبادہ رضی اللہ عنہم سے روایات اخذ کیں۔عبادت کا ذوق وشوق بے انتہا تھا۔چنانچہ عبادات کا اہتمام اتنا زیادہ کیا کہ اللہ نے آپ کو مستجاب الدعوات بنا دیا اور آپ کی کوئی دعا باب اجابت سے واپس نہ لوٹی۔وہ کہا کرتے تھے کہ ’’جنت اور دوزخ کو اپنی آنکھوں سے اگر دیکھ بھی لوں تو وہ میرے تصور سے بڑھ کر نہ ہوگی۔‘‘ (سیر اعلام النبلاء:۴/۷)

نفس کے خطرات سے ہوشیار رہنا

وہ اپنی تعظیم وتکریم کو ناپسند کرتے تھے کہ کہیں تعلّی کا احساس نہ سر اٹھالے۔نفس کے ساتھ ان کا رویہ ہمیشہ معاندانہ ہوتا کیونکہ اس کی چاہتیں جنت سے دور کرتی ہیں۔جو شخص اپنے نفس کے خلاف یہ معاندانہ رویہ اختیار نہیں کرتا وہ سرکش ہوجاتا ہے اور دوستوں کو یہی معاندانہ رویہ اپنانے کی تلقین وتاکید کرتے۔فرماتے ہیں:

میں اپنے نفس کی پذیرائی کروں، اسے آرام وراحت پہنچاؤں تو وہ کل اللہ کے سامنے مجھے رسوا کردے گا اور اگر اس کی تذلیل کروں، اس کو مشقت ومحنت میں لگاؤں کہ وہ تھک جائے تو وہ مجھے اللہ کے سامنے سرخرو کرے گا۔ (صفۃ الصفوۃ: ۲۱۲/۴)

وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ اگر نفس کی جانب سے تھوڑی بھی غفلت سرزد ہوئی تو وہ ہلاکت سے دوچار کردے گا۔اس لیے وہ ہمیشہ اس سے ہوشیار رہتے کہ کہیں اللہ سے دور نہ

☆استاذ حدیث جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

کردے۔حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ میں سخت قحط پڑا۔ وہ لوگوں کو لے کر نماز استسقاء کے لیے نکلے۔ابومسلم خولانی سے کہا:

دیکھئے قحط سے لوگوں کا برا حال ہو رہا ہے۔آپ اللہ سے دعا فرمائیں۔انھوں نے کہا: گناہگار ہوں پھر بھی دعا کروں گا۔ چنانچہ وہ کھڑے ہوئے۔سر پر ایک ٹوپی تھی،ٹوپی ہٹائی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا،عرض کیا:

’’اے اللہ ہم تجھ سے بارش کی التجا کرتے ہیں۔ میں گناہگار ہوں، یہی گناہ لے کے تیری بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں، مجھے ناکام و نامراد نہ لوٹا۔ابھی دعا جاری ہی تھی کہ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔‘‘

بارش ہونے لگی تو ابومسلم نے کہا:

اے اللہ معاویہ نے مجھے شہرت کے مقام پر کھڑا کر دیا۔اگر تیرے پاس میرے لیے بھلائی ہے تو مجھے اپنے پاس بلا لے۔ یہ دعا جمعرات کے دن مانگی تھی اور اگلی جمعرات کو وہ اللہ کے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ (الزھد لاحمد: ۳۹۲)

ان کو اندیشہ تھا کہ لوگوں میں کہیں یہ بات نہ مشہور ہو جائے کہ ابومسلم کی دعا کی بدولت بارش ہوئی اور اس شہرت کی وجہ سے نفس میں خود پسندی آئے کہ اس سے بہتر تو موت ہے۔

ابومسلم کو دنیا کی ہر چیز میں آخرت نظر آتی تھی۔ان کے احساس و شعور پہ آخرت کا اس قدر غلبہ تھا کہ ہر جگہ اور ہر موقع پر آخرت ان کے سامنے آجاتی۔ایک بار ان کا گزر کسی ویرانے سے ہوا۔ وہ کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے:

’’اے ویرانے، اے کھنڈر! تیرے مکیں کہاں گئے؟ وہ تو رخصت ہو گئے، لیکن اپنے اعمال چھوڑ گئے، ان کی خواہشات تو فنا ہو گئیں لیکن گناہوں کے انبار چھوڑ گئیں۔ اے انسانو! سنو، توبہ کرنے سے بہتر ہے کہ گناہ ہی نہ کیا جائے۔‘‘

کاش انسان میری یہ بات سمجھ سکے۔

☆☆☆

میں نے اسلام کیوں قبول کیا؟

ترجمانی: ابوذر اعظمی☆

بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہر مصور الفونس ایتیان دینے (Alphonse Etienne Dinet) ۲۸/مارچ ۱۸۶۱ء میں پیرس میں پیدا ہوئے۔اس کے والد فرانس کے مشہور وکیل تھے اور ماں بھی ایک شہرت یافتہ وکیل کی بیٹی تھیں۔

الفونس کی فطری صلاحیتیں بچپن ہی میں بیدار ہو گئی تھیں، ابھی دوسرے درجہ ہی میں تھے کہ اس کے روشن مستقبل کے خدوخال ظاہر ہونے لگے تھے، غالباً یہی وجہ ہے کہ پیرس کے آرٹ کالج سے منسلک ہوئے اور ٹونی روبیر، جالان اور بوجرو جیسے نامور مصورین سے استفادہ کا موقع ملا۔

فراغت کے بعد ’’لاَ م کلوتید‘‘ نامی وہ پینٹنگ منظر عام پر آئی جسے ۱۸۸۲ء میں پیرس میں منعقدہ نمائش میں پیش کیا گیا اور اسے قبول عام حاصل ہوا۔ایک سال بعد ’’صخرہ صاحوا‘‘ نامی تمثال پیش کیا اور میڈل حاصل کیا۔۱۸۸۴ء میں ’’قصر الصناعۃ‘‘ میڈل حاصل کیا، اسی کے ساتھ ان کا سفر شروع ہوا گمراہی سے ہدایت کی طرف۔

پیرس کی عالمی نمائش میں سلور میڈل حاصل کرنے کے بعد ۱۸۸۹ء میں الفونس نے الجزائر کا سفر کیا اور راجدھانی سے ۲۴۲ کلومیٹر دور ’’بوسعادۃ‘‘ میں قیام کیا، الجزائر اس وقت تک ۵۹ سال سے فرانسیسی استعمار کا شکار تھا۔الفونس کے قیام بوسعادہ کے دوران اس کی ملاقات شہر کے ایک نوجوان سلیمان ابراہیم سے ہوئی جسے فرانسیسی زبان پر کافی عبور حاصل تھا اور یہی خوبی ان دونوں کی قربت اور گہری دوستی کا سبب بنی۔

سلیمان ابراہیم سے الفونس نے عربی زبان سیکھی اور باشندگان جزائر کے عادات واطوار سے شناسائی حاصل کی اور صحرا کی خاک چھانی، یہاں تک کہ صحراء اور بوسعادہ کی محبت اس کے دل و دماغ میں رچ بس گئی۔لہٰذا ۱۹۰۳ء میں وہیں ایک مکان بنوایا اور مستقل سکونت اختیار کرلی اور اپنی فنی

☆استاذ انگریزی، جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ

صلاحیتوں کو بوسعادہ کے باشندگان کی زندہ تصویر پیش کرنے میں صرف کیا اور عمدہ فنکاری کا ثبوت دیا۔

الفونس نے چالیس سال بوسعادہ میں گذارا اور وہاں کے ماحول میں گھل مل گیا اور بہت سی عمدہ عادتیں سیکھیں اور اس پر یہ بات روشن ہوئی کہ یہ عمدہ خصلتیں اسلام کی دین ہیں، لہٰذا اس نے اسلام کا گہرا مطالعہ کرنا شروع کیا اور اس کا دوست سلیمان جو خود اخلاق حسنہ کا پیکر تھا اس کے لیے گائڈ ثابت ہوا، جب اس کا دل پوری طرح مطمئن ہوگیا تو الجزائر کے مفتی اعظم کے سامنے کلمۂ شہادت پڑھ کر قبول اسلام کا اعلان کیا۔ اور کہا:

’’میرا قبول اسلام کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ پوری تحقیق وتفتیش اور مختلف مذاہب کا گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔‘‘ اور اپنا نام ’’الفونس‘‘ سے تبدیل کرکے ’’ناصر الدین‘‘ رکھا۔

قبول اسلام کے بعد الفونس کی فنی تخلیقات پر اسلامی نقوش نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں، جن میں ’’صلاۃ الفجر‘‘ نام کی وہ تصویر بھی ہے جس میں الجزائر کے خاندانی رشتہ کو کچھ اس طرح دکھایا گیا ہے کہ باپ، دادا اور پوتا ایک ہی صف میں تکبیر کہتے ہوئے اپنے ہاتھ اٹھائے ہوئے ہیں۔

۱۹۲۹ء میں اپنی شریک حیات کے ہمراہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی اور اس سفر پہ جانے سے پہلے دو تصویریں اور بنائیں تھیں جن میں ایک کا عنوان ’’الصلاۃ حول الکعبۃ المشرفۃ فی مکۃ المکرّمۃ‘‘ اور دوسرے کا عنوان تھا ’’خانۂ کعبہ کا عمومی منظر‘‘۔

ناصر الدین نے سیرت رسول اکرم ﷺ کا مطالعہ کیا اور اس سے بہت متاثر ہوئے۔ جس کا اظہار انھوں نے ’’محمد رسول اللہ ﷺ‘‘ کے نام سے موسوم اپنی کتاب میں کیا۔ اپنے دوست سلیمان ابراہیم کی رفاقت میں رسول اللہ ﷺ سے ناصر الدین کو بڑا گہرا لگاؤ پیدا ہوگیا اور زیارت کا بے حد شوق پیدا ہوا جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا:

’’میں سکینت و وقار اور خوف محسوس کرتا ہوں جب یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ اس سنہری جالی کے پرے وہ اشرف المخلوقات آرام فرما ہے جس نے سارے عالم سے اپنی نبوت منوائی۔‘‘ زیارت کے بعد اس مقام سے جدائی کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ’’ہم دلوں میں یہ ارمان لیے لوٹے کہ کاش ہمیں دوبارہ اس مقدس مقام کی زیارت کا موقع میسر آئے۔‘‘

وفات سے چند دنوں پہلے ناصر کو اس کا اندازہ ہوگیا تھا، لہٰذا انھوں نے وصیت کی کہ

’’میری تجہیز وتکفین اسلامی طرز پر ہو کیونکہ چند سال پہلے میں نے اسلام کو اپنے دین کے طور پر اختیار کرلیا اور اپنی ساری تگ ودو اس کی ترویج واشاعت میں صرف کردی۔ مجھے بوسعادہ

کے اسلامی قبرستان میں دفنایا جائے جس شہر میں مجھے اپنی اہم تخلیقات کو پیش کرنے کی سعادت ملی، اگر کسی دوسری جگہ میری وفات ہوجائے تو جنازہ بوسعادہ منتقل کیا جائے اور میرے ترکہ سے اخراجات لیے جائیں۔‘‘

الحاج ناصر الدین نے حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد پیرس کا سفر کیا اور تفصیلی سفرنامہ حج رقم ہی کررہے تھے کہ ۲۴ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو پیرس میں انتقال کرگئے۔ ان کی وصیت کو روبہ عمل لاتے ہوئے ان کا جنازہ بوسعادہ منتقل کیا گیا اور ۱۲ر جنوری ۱۹۳۰ء میں ان کے دوست سلیمان ابراہیم کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے گھر کو میوزیم میں تبدیل کردیا گیا تاکہ اس عظیم فنکار کی کاوشوں کو حیاتِ جاوداں نصیب ہو، یہ میوزیم آج بھی انھیں کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ (بشکریہ: المجتمع، الکویت)

☆☆☆

یہ بھی تو اک دلیل ہے اس کے وجود کی......

امام شافعیؒ سے پوچھا گیا کہ اللہ کے وجود کی کیا دلیل ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: شہتوت کا پتا۔ پھر ان سے سوال کیا گیا کہ: یہ کیسے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ: ریشم کا کیڑا اسے کھاتا ہے تو ریشم وجود میں آتا ہے، شہد کی مکھی کھاتی ہے تو شہد پیدا کرتی ہے، بکری کھاتی ہے تو دودھ دیتی ہے اور ہرن کھاتا ہے تو مشک وجود میں آتا ہے۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے وہ اللہ جو سب سے بہترین پیدا کرنے والا ہے۔ پھر انھوں نے شعر پڑھا ؎

۱-سورج اور چاند اس کی حکمت کے تجلیات ہیں اور خشکی اور تری اس کی نوازشوں کا فیض ہیں۔

۲-جنگلی جانور اس کی عظمت کے ترانے پڑھتے ہیں، پرندے اس کی تسبیح میں زمزمہ سنج رہتے ہیں، موجیں اس کی کبریائی کے گیت گاتی ہیں اور مچھلیاں اس سے سرگوشی کرتی ہیں۔

۳-اور چیونٹیاں مضبوط چٹانوں کے نیچے اس کی بزرگی بیان کرتی ہیں اور شہد کی مکھیاں اپنے چھتوں میں اس کی حمد وثنا میں رطب اللسان رہتی ہیں۔

۴-اور انسان علانیہ اس کی نافرمانی کرتا ہے مگر وہ اس کے گناہوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور بندہ اسے فراموش کردیتا ہے حالانکہ میرا پالنہارا سے یاد رکھتا ہے۔ (اقبال احمد اصلاحی ندوی)

تفہیم القرآن — ایک مطالعہ

مولانا محمد اسماعیل فلاحی☆

تفہیم-اسرائیلیات کی تردید

اسی طرح تفسیر کے دوران اسرائیلیات کی بھی تردید کرتے گئے ہیں، مثال کے طور پر سورہ طٰہٰ:۸۷ میں **ولکنا حملنا اوزارا من زینة القوم** [لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے ہم لد گئے تھے] اس پر صاحب تفہیم کا درج ذیل نوٹ ہے۔

اس کا سیدھا مطلب تو یہ ہے کہ ہمارے مردوں اور عورتوں نے مصری رسموں کے مطابق جو بھاری بھاری زیورات پہن رکھے تھے وہ اس صحرا نوردی میں ہم پر بار ہو گئے تھے اور ہم پریشان تھے کہ اس بوجھ کو کہاں تک لادے پھریں لیکن بائبل کا بیان ہے کہ یہ زیورات مصر سے چلتے وقت ہر اسرائیلی گھرانے کی عورتوں اور مردوں نے اپنے مصری پڑوسی سے مانگ کر لے لیے تھے اور اس طرح ہر ایک اپنے پڑوسی کو لوٹ کر راتوں رات 'ہجرت' کے لیے چل کھڑا ہوا تھا۔ یہ اخلاقی کارنامہ صرف اسی حد تک نہ تھا کہ ہر اسرائیلی نے بطور خود اسے انجام دیا ہو بلکہ یہ کارِ خیر اللہ کے نبی حضرت موسیٰؑ نے ان کو سکھایا تھا اور نبی کو بھی اس کی ہدایت اللہ میاں نے دی تھی۔''

اس کے بعد بائبل کی کتاب خروج باب ۳ آیت ۱۴ تا ۲۲ اور باب ۱۱ آیت ۲-۳، باب ۱۲ آیت ۳۵-۳۶ کا حوالہ دینے کے بعد لکھتے ہیں:

''افسوس ہے کہ ہمارے مفسرین نے بھی قرآن کی اس آیت کی تفسیر میں بنی اسرائیل کی اس روایت کو آنکھیں بند کر کے نقل کر دیا ہے اور ان کی اس غلطی سے مسلمانوں میں بھی یہ خیال پھیل گیا ہے کہ زیورات کا یہ بوجھ اسی لوٹ کا بوجھ

☆استاذ تفسیر جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

تھا.....'' (تفہیم ج ۳ ص ۱۱۵-۱۱۶ حاشیہ ۶۷، سورہ طٰہٰ)

اس سورہ میں **واحلل عقدة من لسانی یفقهوا قولی** (طٰہٰ:۲۷-۲۸) کا ترجمہ کرتے ہیں ''اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں'' اس آیت پر ان کا یہ نوٹ ہے۔

بائبل میں اس کی جو تشریح بیان ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا: اے خداوند، میں فصیح نہیں ہوں، نہ پہلے تھا اور نہ جب سے تو نے اپنے بندے سے کلام کیا، بلکہ رک رک کر بولتا ہوں اور میری زبان کند ہے۔ (خروج ۴:۱۰) مگر تلمود میں اس کا ایک لمبا چوڑا قصہ بیان ہوا ہے، اس میں یہ ذکر ہے کہ بچپن میں حضرت موسیٰ فرعون کے گھر پرورش پا رہے تھے، ایک روز انھوں نے فرعون کے سر کا تاج اتار کر اپنے سر پر رکھ لیا، اس پر یہ سوال پیدا ہوا کہ اس بچے نے یہ کام بالارادہ کیا ہے یا یہ محض طفلانہ فعل ہے۔ آخر کار یہ تجویز کیا گیا کہ بچے کے سامنے سونا اور آگ دونوں ساتھ رکھے جائیں۔ چنانچہ دونوں چیزیں لا کر سامنے رکھی گئیں اور حضرت موسیٰ نے اٹھا کر آگ منھ میں رکھ لی۔ اس طرح ان کی جان تو بچ گئی مگر زبان میں ہمیشہ کے لیے لکنت پڑ گئی۔

یہ قصہ اسرائیلی روایات سے منتقل ہو کر ہمارے ہاں کی تفسیروں میں بھی رواج پا گیا، لیکن عقل اسے ماننے سے انکار کرتی ہے۔ اس لیے کہ اگر بچے نے آگ پر ہاتھ مارا بھی ہو تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ وہ انگارے کو اٹھا کر منھ میں لے جا سکے۔ بچہ تو آگ کی جلن محسوس کرتے ہی ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ منھ میں لے جانے کی نوبت ہی کہاں آ سکتی ہے؟ قرآن کے الفاظ سے جو بات ہماری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ اپنے اندر خطابت کی صلاحیت نہیں پاتے تھے اور ان کو اندیشہ لاحق تھا کہ نبوت کے فرائض ادا کرنے کے لیے اگر تقریر کی ضرورت کبھی پیش آئی (جس کا انھیں اس وقت تک اتفاق نہ ہوا تھا) تو ان کی طبیعت کی جھجک مانع ہو جائے گی۔ اس لیے انھوں نے دعا فرمائی کہ یا اللہ میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ میں اچھی طرح اپنی بات لوگوں کو سمجھا سکوں۔''

اس کے بعد قرآن کی بعض آیات کے حوالہ سے اپنی بات مزید واضح کرنے کے بعد آگے لکھتے ہیں:

''یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ہکلے یا توتلے آدمی کو اپنا

رسول مقرر فرمائے۔ رسول ہمیشہ شکل وصورت، شخصیت اور صلاحیتوں کے لحاظ سے بہترین لوگ ہوئے ہیں، جن کے ظاہر و باطن کا ہر پہلو دلوں اور نگاہوں کو متاثر کرنے والا ہوتا تھا۔ کوئی رسول ایسے عیب کے ساتھ نہیں بھیجا گیا اور نہیں بھیجا جاسکتا تھا جس کی بنا پر وہ لوگوں میں مضحکہ بن جائے یا حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔'' (تفہیم ج ۳ ص ۹۳-۹۲ سورہ طٰہٰ حاشیہ ۱۵)

سورہ انبیاء:۸۳-۸۴ میں حضرت ایوبؑ کا ذکر ہے: **وایوب اذ نادی ربہ انی مسنی الضر وانت ارحم الراحمین......وذکریٰ للعابدین** (انبیاء:۸۳-۸۴) ترجمہ یوں کیا ہے ''اور یہی (ہوشمندی اور حکم وعلم کی نعمت) ہم نے ایوب کو دی تھی، یاد کرو جبکہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے، ہم نے اس کی دعا قبول کی اور جو تکلیف اسے تھی اس کو دور کر دیا اور صرف اس کے اہل وعیال ہی اس کو نہیں دیے بلکہ ان کے ساتھ اتنے ہی اور بھی دیے اپنی خاص رحمت کے طور پر اور اس لیے کہ یہ ایک سبق ہو عبادت گزاروں کے لیے'' ان آیات پر نوٹ ہے، اس کا کچھ حصہ درج ذیل ہے۔

''دعا کا انداز کس قدر لطیف ہے، مختصر ترین الفاظ میں اپنی تکلیف کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے بعد بس یہ کہہ کر رہ جاتے ہیں کہ ''تو ارحم الراحمین ہے'' آگے کوئی شکوہ یا شکایت نہیں، کوئی عرض مدعا نہیں، کسی چیز کا مطالبہ نہیں۔ اس طرز دعا میں کچھ ایسی شان نظر آتی ہے جیسے کوئی انتہائی صابر وقانع اور شریف و خوددار آدمی پے در پے فاقوں سے بے تاب ہو اور کسی نہایت کریم النفس ہستی کے سامنے بس اتنا کہہ کر رہ جائے کہ ''میں بھوکا ہوں اور آپ فیاض ہیں'' آگے کچھ اس کی زبان سے نہ نکل سکے۔''

آگے لکھتے ہیں:

''اس قصے میں قرآن مجید حضرت ایوبؑ کو اس شان سے پیش کرتا ہے کہ وہ صبر کی تصویر نظر آتے ہیں اور پھر کہتا ہے کہ ان کی زندگی عبادت گزاروں کے لیے نمونہ ہے، لیکن دوسری طرف بائبل کے پیغمبر ایوبؑ پڑھیے تو وہاں آپ کو ایک ایسے شخص کی تصویر نظر آئے گی جو خدا کے خلاف مجسم شکایت اور اپنی مصیبت پر ہمہ تن فریاد بنا ہوا ہے......وہ خدا کے خلاف شکایتیں کرتا ہے...... پے در پے خدا پر

الزام رکھے چلا جاتا ہے...... وہ ایک ایک کر کے اپنی نیکیاں گناتا ہے اور پھر وہ تکلیفیں بیان کرتا ہے جو ان کے بدلے میں خدا نے اس پر ڈالیں اور پھر کہتا ہے کہ خدا کے پاس اگر کوئی جواب ہے تو وہ مجھے بتائے کہ یہ سلوک میرے ساتھ کس قصور کی پاداش میں کیا گیا ہے...... پھر ان کے (اللہ کے) اور ایوبؑ کے درمیان خوب دوبدو بحث ہوتی ہے۔ اس ساری داستان کو پڑھتے ہوئے کسی جگہ بھی ہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم اس صبر مجسم کا حال اور کلام پڑھ رہے ہیں جس کی تصویر عبادت گزاروں کے لیے سبق بنا کر قرآن نے پیش کی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کا ابتدائی حصہ کچھ کہہ رہا ہے، بیچ کا حصہ کچھ اور آخر میں نتیجہ کچھ اور نکل آتا ہے، تینوں حصوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے ...... یہ کتاب خود اپنے منہ سے بول رہی ہے کہ یہ نہ خدا کا کلام ہے نہ خود حضرت ایوبؑ کا۔ بلکہ یہ حضرت ایوبؑ کے زمانے کا بھی نہیں ہے، ان کے صدیوں بعد کسی شخص نے قصہ ایوب کو بنیاد بنا کر ''یوسف زلیخا'' کی طرح ایک داستان لکھی ہے......'' (تفہیم ج ۳ سورہ انبیاء حاشیہ ۷۷ و ۷۹ ص ۱۷۹-۱۸۱)

سورہ القصص میں **فوکزہ موسیٰ فقضیٰ علیہ قال ھٰذا من عمل الشیطان انہ عدو مضل مبین قال رب انی ظلمت نفسی فاغفر لی فغفر لہ انہ ھو الغفور الرحیم** (قصص:۱۵-۱۶)

اس آیت کی تشریح کے بعد لکھتے ہیں ''اس معاملے میں بائبل کا بیان قرآن سے مختلف ہے، وہ حضرت موسیٰ کو قتل عمد کا مجرم ٹھیراتی ہے۔ اس کی روایت یہ ہے کہ مصری اور اسرائیلی کو لڑتے دیکھ کر حضرت موسیٰؑ نے 'ادھر ادھر نگاہ کی اور جب دیکھا کہ وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے تو اس مصری کو جان سے مار کر اسے ریت میں چھپا دیا' (خروج ۲:۱۲) یہی بات تلمود میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اب یہ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ بنی اسرائیل اپنے اکابر کی سیرتوں کو خود کس طرح داغدار کرتے ہیں اور قرآن کس طرح ان کی پوزیشن صاف کرتا ہے، عقل بھی یہی کہتی ہے کہ ایک حکیم و دانا آدمی جسے آگے چل کر ایک اولوالعزم پیغمبر ہونا تھا اور جسے انسان کو عدل وانصاف کا ایک عظیم الشان قانون دینا تھا، ایسا اندھا قوم پرست نہیں ہوسکتا کہ اپنی قوم کے ایک فرد سے دوسری قوم کے کسی شخص کو لڑتے دیکھ کر آپے سے باہر ہوجائے اور جان بوجھ کر اسے قتل کر ڈالے......'' (سورہ قصص حاشیہ ۲۲ تفہیم

ج۳ص۶۲۲)

سورہ ص فظنّ داؤد انما فتنا......فغفرنا له ذلک آیت۲۴-۲۵ حاشیہ۲۷-۲۸ میں اہل کتاب نے حضرت داؤدؑ پر زنا کا جو الزام لگایا ہے، اس کی دلائل سے تردید کرتے ہیں۔ (تفہیم ج۴ص۳۲۶-۳۳۱-۳۳۱سورہ ص حاشیہ۲۷-۲۸)

سورہ یوسف وشروہ بثمن بخش دراھم معدودة......(سورہ یوسف:۲۱) حضرت یوسف کو کنویں سے قافلہ والوں کے نکالنے کے بعد کس نے بیچا؟ شروا کا فاعل کون ہے؟ مسلمانوں میں یہ روایت مشہور ہے کہ برادران یوسف نے حضرت یوسف کو قافلہ والوں کے ہاتھوں فروخت کیا تھا، پھر قافلہ والوں نے مصر لے جا کر بیچا۔ قرآن سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ بائبل کتاب پیدائش باب ۳۷ آیت ۲۵ تا ۲۸ و ۳۶ اور تلمود سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ صاحب تفہیم اس پر اچھی گفتگو کرتے اور کہتے ہیں کہ شروا کا فاعل اہل قافلہ ہیں، برادران یوسف نہیں۔ (تفہیم ج۲ص۳۹۰)

سورہ یوسف ۲۳ تا ۲۹ میں امرأة العزیز کے ڈورے ڈالنے اور یوسفؑ کی پاکدامنی کا جس انداز سے ذکر ہے اس کا بیان بائبل میں جس بھونڈے طریقہ سے کیا گیا ہے اس کی دھجی صاحب تفہیم نے بکھیر دی ہے، ملاحظہ ہو تفہیم ج۲ سورہ یوسف حاشیہ۲۵ص۳۹۵-۳۹۶)

سورہ یوسف آیت ۵۰ میں ذکر ہے کہ شاہی فرستادہ جب یوسف کے پاس پہنچا تو انھوں نے پہلے اپنی پوزیشن صاف کرائی، معاملہ کی تحقیق ہوئی، مجرمین نے اپنے جرم کا اقرار کیا، اس کے بعد حضرت یوسفؑ بادشاہ سے ملنے آئے۔ بائبل بادشاہ کی طلبی پر جس انداز سے حضرت یوسفؑ کے آنے کا ذکر کرتی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنے جلیل القدر پیغمبر کو کتنا گرا کر پیش کیا ہے اور قرآن ان کے قید سے نکلنے اور بادشاہ سے ملنے کا واقعہ کس شان سے پیش کرتا ہے۔ (تفہیم ج۲ سورہ یوسف حاشیہ۴۲ص۴۰۷-۴۰۸)

سورہ طٰہٰ آیات ۱۱۵-۱۲۴ میں آدم وحوا کی تخلیق، فرشتوں کے سجدہ، ابلیس کے انکار اور آدم وحوا کو بہکانے اور شجر ممنوعہ سے کھانے پھر توبہ اور قبولیت توبہ اور دنیا میں آنے کا ذکر ہے، لیکن بائبل میں اس واقعہ کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے، وہ قرآن کے بیان سے مطابقت نہیں رکھتا، اس میں کئی قابل اعتراض چیزیں ہیں، صاحب تفہیم ان پر گفتگو کے بعد آخر میں لکھتے ہیں ''بائبل کے اس بیان اور قرآن کے بیان کو ذرا وہ لوگ بالمقابل رکھ کر دیکھیں جو یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ قرآن میں یہ قصے بنی اسرائیل سے نقل کر لیے گئے ہیں۔'' (تفہیم ج۳ سورہ طٰہٰ حاشیہ۱۰۶ص۱۳۴-۱۳۶)

مستشرقین کا ردّ

صاحب تفہیم نے جس طرح اسرائیلیات کی قلعی کھولی ہے، اسی طرح اپنی تفسیر میں مستشرقین کا بھی تعاقب کیا ہے، نمونے ملاحظہ ہوں۔

سورہ طٰہٰ آیت ۸۵ میں سامری کا لفظ آیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر کس طرح اس نے بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی میں مبتلا کر دیا۔ لفظ سامری پر مصنف کا نوٹ دیکھیے۔

''یہ اس شخص کا نام نہیں ہے بلکہ یائے نسبتی کی صریح علامت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہرحال کوئی نہ کوئی نسبت ہی ہے، خواہ قبیلے کی طرف ہو یا نسل کی طرف یا مقام کی طرف۔ پھر قرآن جس طرح السامری کہہ کر اس کا ذکر کر رہا ہے، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سامری قبیلے یا نسل یا مقام کے بہت سے لوگ موجود تھے جن میں سے ایک خاص سامری وہ شخص تھا جس نے بنی اسرائیل میں سنہری بچھڑے کی پرستش پھیلائی۔ اس سے زیادہ کوئی تشریح قرآن کے اس مقام کی تفسیر کے لیے فی الحقیقت درکار نہیں ہے، لیکن یہ مقام ان اہم مقامات میں سے ہے جہاں عیسائی مشنریوں اور خصوصاً مغربی مستشرقین نے قرآن پر حرف گیری کی حد کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ معاذ اللہ، قرآن کے مصنف کی جہالت کا صریح ثبوت ہے، اس لیے کہ دولتِ اسرائیل کا دارالسلطنت ''سامریہ'' اس واقعہ کے کئی صدی بعد ۹۳۵ ق م کے قریب زمانے میں تعمیر ہوا، پھر اس کے بھی کئی صدی بعد اسرائیلیوں اور غیر اسرائیلیوں کی وہ مخلوط نسل پیدا ہوئی جس نے 'سامریوں' کے نام سے شہرت پائی۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ان سامریوں میں چونکہ دوسری مشرکانہ بدعات کے ساتھ ساتھ سنہری بچھڑے کی پرستش کا رواج بھی تھا اور یہودیوں کے ذریعہ سے محمدﷺ نے اس بات کی سُن گُن پالی ہوگی، اس لیے انھوں نے لے جا کر اس کا تعلق حضرت موسیٰ کے عہد سے جوڑ دیا اور یہ قصہ تصنیف کر ڈالا کہ وہاں سنہری بچھڑے کی پرستش رائج کرنے والا ایک سامری شخص تھا، اس طرح کی باتیں ان لوگوں نے ہامان کے معاملہ میں بنائی ہیں جسے قرآن فرعون کے وزیر کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور عیسائی مشنری اور مستشرقین اسے اخسویرس (شاہ ایران) کے درباری امیر 'ہامان' سے لے جا کر ملا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن کے مصنف کی جہالت کا ایک اور ثبوت ہے۔ شاید ان مدعیانِ علم وتحقیق کا گمان یہ ہے کہ قدیم زمانے میں ایک نام کا ایک ہی شخص یا قبیلے یا مقام ہوا کرتا تھا اور ایک نام کے دو یا زائد اشخاص یا قبلہ و مقام ہونے کا قطعاً کوئی امکان نہ تھا۔ حالانکہ سمیری قدیم

تاریخ کی ایک نہایت مشہور قوم تھی جو حضرت ابراہیمؑ کے دور میں عراق اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں چھائی ہوئی تھی اور اس بات کا بہت امکان ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے عہد میں اس قوم کے یا اس کی کسی شاخ کے لوگ مصر میں سامری کہلاتے ہوں۔ پھر خود اس سامریہ کی اصل کو بھی دیکھ لیجیے جس کی نسبت سے شمالی فلسطین کے لوگ بعد میں سامری کہلانے لگے۔ بائبل کا بیان ہے کہ دولتِ اسرائیل کے فرمانروا عمیری نے ایک شخص ''سمیر'' نامی سے وہ پہاڑ خریدا تھا جس پر اس نے بعد میں اپنا دارالسلطنت تعمیر کیا اور چونکہ پہاڑ کے سابق مالک کا نام سمر تھا اس لیے اس شہر کا نام سامریہ رکھا گیا، (سلاطین باب ۱۶ آیت ۲۴) اس سے صاف ظاہر ہے کہ سامریہ کے وجود میں آنے سے پہلے ''سمر'' نام کے اشخاص پائے جاتے تھے اور ان سے نسبت پا کر ان کی نسل یا قبیلے کا نام سامری اور مقامات کا نام سامریہ ہونا کم از کم ممکن ضرور تھا۔'' (تفہیم ج ۳ حاشیہ ۶۳ ص ۱۱۳-۱۱۴)

لفظ ہامان پر سورہ قصص آیت ۶ میں صاحب تفہیم رقم طراز ہیں:

''مغربی مستشرقین نے اس بات پر بڑی لے دے کی ہے کہ ہامان تو ایران کے بادشاہ اخسویرس یعنی خشیارشا (Xerxes) کے دربار کا ایک امیر تھا اور اس بادشاہ کا زمانہ حضرت موسیٰؑ کے سینکڑوں برس بعد ۴۸۶ اور ۴۶۵ قبل مسیح گزرا ہے، مگر قرآن نے اسے مصر لے جا کر فرعون کا وزیر بتا دیا۔ ان لوگوں کی عقل پر تعصب کا پردہ پڑا ہوا نہ ہو تو یہ خود غور کریں کہ آخر ان کے پاس یہ یقین کرنے کے لیے کیا تاریخی ثبوت موجود ہے کہ اخسویرس کے درباری ہامان سے پہلے دنیا میں کوئی شخص کبھی اس نام کا نہیں گزرا ہے۔ جس فرعون کا ذکر یہاں ہو رہا ہے اگر اس کے تمام وزراء اور امراء اور اہل دربار کی کوئی مکمل فہرست بالکل مستند ذریعے سے کسی مستشرق صاحب کو مل گئی ہے جس میں ہامان کا نام مفقود ہے تو وہ اسے چھپائے کیوں بیٹھے ہیں؟ انھیں اس کا فوٹو فوراً شائع کر دینا چاہیے کیونکہ قرآن کی تکذیب کے لیے اس سے زیادہ مؤثر ہتھیار انہیں کوئی اور نہ ملے گا۔'' (تفہیم ج ۳ سورہ قصص، حاشیہ ۸ ص ۶۱۵-۶۱۶)

بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کے فتنہ کا اصل بانی قرآن سامری کو بتاتا ہے اور حضرت ہارونؑ کے سلسلہ میں اس کا بیان ہے کہ انھوں نے اس فتنہ سے بنی اسرائیل کو روکنے کی پوری کوشش کی۔ سورہ طٰہٰ آیت ۹۱ میں حضرت ہارونؑ کی اس کوشش کا ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں سید مودودی تحریر فرماتے ہیں:

''بائبل اس کے برعکس حضرت ہارون پر الزام رکھتی ہے کہ بچھڑا بنانے

اور اسے معبود قرار دینے کا گناہِ عظیم انہی سے سرزد ہوا تھا۔''

اس کے بعد جناب مودودی خروج باب ۳۲ آیت ۱-۵ کا لمبا اقتباس نقل کر کے آگے لکھتے ہیں:

''بہت ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں یہ غلط روایت اس وجہ سے مشہور ہوئی ہو کہ سامری کا نام بھی ہارونؑ ہی ہو اور بعد کے لوگوں نے اس ہارون کو ہارون نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہو، لیکن آج عیسائی مشنریوں اور مغربی مستشرقوں کو اصرار ہے کہ قرآن یہاں بھی ضرور غلطی پر ہے، بچھڑے کو خدا ان کے مقدس نبی نے ہی بنایا تھا اور ان کے دامن سے اس داغ کو صاف کر کے قرآن نے ایک احسان نہیں بلکہ الٹا قصور کیا ہے۔ یہ ان لوگوں کی ہٹ دھرمی کا حال اور ان کو نظر نہیں آتا کہ اسی باب میں چند سطر آگے چل کر خود بائبل اپنی غلط بیانی کا راز کس طرح فاش کر رہی ہے۔ اس باب کی آخری دس آیتوں میں بائبل یہ بیان کرتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس کے بعد بنی لاط کو جمع کیا اور اللہ تعالیٰ کا یہ حکم سنایا کہ جن لوگوں نے شرک کا یہ گناہ عظیم کیا ہے انھیں قتل کیا جائے اور ہر ایک مومن خود اپنے ہاتھ سے اپنے اس بھائی اور ساتھی اور پڑوسی کو قتل کرے جو گوسالہ پرستی کا مرتکب ہوا تھا۔ چنانچہ اس روز تین ہزار آدمی قتل کیے گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت ہارون کیوں چھوڑ دیے گئے؟ اگر وہی اس جرم کے بانی مبانی تھے تو انہیں اس قتل عام سے کس طرح معاف کیا جا سکتا تھا؟ کیا بنی لاوی یہ نہ کہتے کہ موسیٰ ہم کو تو حکم دیتے ہو کہ ہم اپنے گناہ گار بھائیوں اور ساتھیوں اور پڑوسیوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کریں مگر خود اپنے بھائی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے حالانکہ اصل گناہ گار وہی تھا؟ آگے چل کر بیان کیا جاتا ہے کہ موسیٰؑ نے خداوند کے پاس جا کر عرض کیا کہ اب بنی اسرائیل کا گناہ معاف کر دے، ورنہ میرا نام اپنی کتاب سے مٹا دے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ ''جس نے میرا گناہ کیا ہے میں اسی کا نام اپنی کتاب سے مٹاؤں گا'' لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ہارون کا نام نہ مٹایا گیا بلکہ اس کے برعکس ان کو اور ان کی اولاد کو بنی اسرائیل میں بزرگ ترین منصب یعنی بنی لاوی کی سرداری اور مقدس کی کہانت سے سرفراز کیا گیا (گنتی باب ۱۸ آیت ۱-۷) کیا بائبل کی یہ اندرونی شہادت خود اس کے اپنے سابق بیان کی تردید اور قرآن کے

بیان کی تصدیق نہیں کر رہی ہے۔'' (تفہیم ج ۳ سورہ طٰہٰ حاشیہ ۶۹ ص ۱۱۷-۱۱۸)

انسان کی تخلیق کیسے ہوئی؟ اس سلسلہ میں ایک بیان قرآن کا ہے اور ایک نقطۂ نظر عصر حاضر کے سائنس دانوں کا ہے جو ڈارون کے نظریے کے علمبردار ہیں۔ سید مودودی سورہ سجدہ آیت ۹ حاشیہ ۱۴ اور سورہ اعراف آیت ۱۱ حاشیہ ۱۰ میں ڈارون کے نقطۂ نظر کو دلائل سے رد کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو تفہیم ج ۴ ص ۴۰ اور تفہیم ج ۲ ص ۱۰-۱۱)

تجدد پسند مفسرین کا تعاقب

سید مودودی نے اپنی تفسیر میں عصر جدید کے بعض تجدد پسند اور مغرب سے مرعوب مفسرین کا بھی تعاقب کیا ہے۔ سورہ نمل میں حضرت سلیمان کے لشکروں کا ذکر ہے۔ **وحشر لسلیمٰن جنوده من الجن والانس والطير** (۱۷) سلیمانؑ کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے۔ بعض متجددین کو جن اور طیر سے جنات اور پرندے مراد لینے سے انکار ہے۔ مولانا اس پر یہ تبصرہ کرتے ہیں۔

''......موجودہ زمانہ کے بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے کہ جن اور طیر سے مراد جنات اور پرندے نہیں ہیں بلکہ انسان ہی ہیں جو حضرت سلیمانؑ کے لشکر میں مختلف کام کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ جن سے مراد پہاڑی قبائل کے وہ لوگ ہیں جنھیں حضرت سلیمان نے مسخر کیا تھا اور وہ ان کے ہاں حیرت انگیز طاقت اور محنت کے کام کرتے تھے اور طیر سے مراد گھوڑ سواروں کے دستے ہیں جو پیدل دستوں کی بہ نسبت بہت زیادہ تیزی سے نقل وحرکت کرتے تھے، لیکن یہ قرآن مجید میں بے جا تاویل کی بدترین مثالیں ہیں۔ قرآن یہاں جن، انس اور طیر تین الگ الگ اقسام کے لشکر بیان کر رہا ہے اور تینوں پر الف لام تعریف جنس کے لیے لایا گیا ہے۔ اس لیے لامحالہ الجن اور الطیر ، الانس میں شامل نہیں ہو سکتا بلکہ وہ اس سے مختلف دو الگ اجناس ہی ہو سکتی ہیں۔ علاوہ بریں کوئی شخص جو عربی زبان سے ذرہ برابر بھی واقفیت رکھتا ہو، یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اس زبان میں محض لفظ الجن بول کر انسانوں کا کوئی گروہ یا محض الطیر بول کر سواروں کا رسالہ کبھی مراد لیا جا سکتا ہے اور کوئی عرب ان الفاظ کو سن کر ان کے یہ معنی سمجھ سکتا ہے۔ محض محاورے میں کسی انسان کو اس کے فوق العادۃ کام کی وجہ سے

جنّ یا کسی عورت کو اس کے حسن کی وجہ سے پری اور کسی تیز رفتار آدمی کو پرندہ کہہ دینا یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ اب جنّ کے معنیٰ طاقت ور آدمی اور پری کے معنیٰ حسین عورت اور پرندے کا معنیٰ تیز رفتار انسان کے ہو جائیں۔ ان الفاظ کے یہ معنیٰ تو مجازی ہیں نہ کہ حقیقی اور کسی کلام میں کسی لفظ کو حقیقی معنیٰ چھوڑ کر مجازی معنوں میں صرف اسی وقت استعمال کیا جاتا ہے اور سننے والے بھی ان کو مجازی معنوں میں صرف اسی وقت لے سکتے ہیں جب کہ آس پاس کوئی واضح قرینہ ایسا موجود ہو جو اس کے مجاز ہونے پر دلالت کرتا ہو، یہاں آخر کون سا قرینہ پایا جاتا ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکے کہ جن اور طیر کے الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں؟ بلکہ آگے ان دونوں گروہون کے ایک ایک فرد کا جو حال اور کام بیان کیا گیا ہے وہ تو اس تاویل کے بالکل خلاف معنیٰ پر صریح دلالت کر رہا ہے۔ کسی شخص کا دل اگر قرآن کی بات پر یقین نہ کرنا چاہتا ہو تو اسے صاف کہنا چاہیے کہ میں اس بات کو نہیں مانتا لیکن یہ بڑی اخلاقی بزدلی اور علمی خیانت ہے کہ آدمی قرآن کے صاف صاف الفاظ کو توڑ مروڑ کر اپنے من مانے معنیٰ پر ڈھالے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ قرآن کے بیان کو مانتا ہے، حالانکہ دراصل قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اسے نہیں بلکہ خود اپنے زبردستی گھڑے ہوئے مفہوم کو مانتا ہے۔''
(تفہیم ج ۳ سورہ نمل حاشیہ ۲۳ ص ۵۶۲-۵۶۳)

اس سورہ نمل آیت ۱۸ میں حضرت سلیمان کے چیونٹیوں کی وادی سے گزرنے اور ایک چیونٹی کے چیونٹیوں کو خبردار کرنے کا ذکر ہے اور اس کے آگے آیت ۲۰ میں ہد ہد کا ذکر آیا ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ شام کے علاقہ کی ایک وادی کا نام وادیٔ نملہ ہے اور نملہ کے معنیٰ ایک چیونٹی کے نہیں بلکہ یہ ایک قبیلہ کا نام ہے اور ہد ہد سے مراد وہ پرندہ نہیں ہے جو عربی اور اردو زبان میں اس نام سے معروف ہے بلکہ یہ ایک آدمی کا نام ہے جو حضرت سلیمانؑ کی فوج میں ایک افسر تھا۔ صاحب تفہیم نے اس بے بنیاد تاویل کا جس طرح تعاقب کیا ہے پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ (ملاحظہ ہو تفہیم ج ۳ سورہ نمل حاشیہ ۲۴، ۲۶ و ۲۸ ص ۵۶۳-۵۶۸)

تفہیم اور منکرین حدیث

سید مودودی نے جس طرح اپنی تفسیر میں تجدد پسندوں پر تنقید کی ہے اسی طرح منکرین

حدیث کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔ سورہ روم آیت ۱۷-۱۸ فسبحان الله حين تمسون...... وحين تظهرون کا ترجمہ کرتے ہیں ''پس تسبیح کرو اللہ کی جبکہ تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو، آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے حمد ہے اور (تسبیح کرو اس کی) تیسرے پہر اور جبکہ تم پر ظہر کا وقت آتا ہے''۔ بنی اسرائیل ۷۸، ہود ۱۱۴، اور طٰہٰ ۱۳۰ کی روشنی میں اس آیت کی تشریح کرنے کے بعد ان کا قلم یوں چلتا ہے۔

''...... یہاں ذرا تھوڑی دیر ٹھیر کر منکرین حدیث کی اس جسارت پر غور کیجئے کہ وہ ''نماز پڑھنے'' کا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نماز جو آج مسلمان پڑھ رہے ہیں یہ سرے سے وہ چیز ہی نہیں ہے جس کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ قرآن تو اقامت صلوٰۃ کا حکم دیتا ہے اور اس سے مراد نماز پڑھنا نہیں بلکہ ''نظام ربوبیت'' قائم کرنا ہے۔ اب ذرا ان سے پوچھیے کہ وہ کونسا نرالا نظامِ ربوبیت ہے جسے یا تو طلوع آفتاب سے پہلے قائم کیا جاسکتا ہے یا پھر زوال آفتاب کے بعد سے کچھ رات گزرنے تک؟ اور وہ کونسا نظامِ ربوبیت ہے جو خاص جمعہ کے دن قائم کیا جانا مطلوب ہے؟ (اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعة فاسعوا الی ذکر الله) اور نظامِ ربوبیت کی آخر وہ کونسی خاص قسم ہے کہ اسے قائم کرنے کے لیے جب آدمی کھڑا ہو تو پہلے منھ اور کہنیوں تک ہاتھ اور ٹخنوں تک پاؤں دھولے اور سر پر مسح کرلے ورنہ وہ اسے قائم نہیں کرسکتا؟ (اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق) اور نظامِ ربوبیت کے اندر آخر یہ کیا خصوصیت ہے کہ اگر آدمی حالت جنابت میں ہو تو جب تک وہ غسل نہ کرلے اسے قائم نہیں کرسکتا؟ (لا تقربوا الصلوٰۃ...... ولا جنباً الا عابر سبیل حتی تغتسلوا) اور یہ کیا معاملہ ہے کہ اگر آدمی عورت کو چھو بیٹھا ہو اور پانی نہ ملے تو اس عجیب و غریب نظامِ ربوبیت کو قائم کرنے کے لیے اسے پاک مٹی پر ہاتھ مار کر اپنے چہرے اور منھ پر ملنا ہوگا؟ (أو لامستم النساء فلم تجدوا ماء فتيمموا صعيداً طيباً فامسحوا بوجوهكم وايديكم منه) اور یہ کیسا عجیب نظامِ ربوبیت ہے کہ اگر سفر پیش آجائے تو آدمی اسے پورا قائم کرنے کے بجائے آدھا ہی قائم کرے؟ (واذا ضربتم فی الارض

فليس عليكم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ) پھر یہ کیا لطیفہ ہے کہ اگر جنگ کی حالت ہو تو فوج کے آدھے سپاہی ہتھیار لیے ہوئے امام کے پیچھے ''نظام ربوبیت'' قائم کرتے رہیں اور آدھے دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہیں، اس کے بعد جب پہلا گروہ امام کے پیچھے ''نظامِ ربوبیت'' قائم کرتے ہوئے ایک سجدہ کرلے تو وہ اٹھ کر دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے چلا جائے اور دوسرا گروہ اس کی جگہ آکر امام کے پیچھے اس ''نظام ربوبیت'' کو قائم کرنا شروع کردے (واذا كنت فيهم فاقمت لهم الصلوٰۃ فلتقم طائفة منهم معك وليأخذوا اسلحتهم فاذا سجدوا فليكونوا من ورائكم ولتأت طائفة اخرى لم يصلوا فليصلوا معك) قرآن مجید کی یہ ساری آیات صاف بتارہی ہیں کہ اقامت صلوٰۃ سے مراد وہی نماز قائم کرنا ہے جو مسلمان دنیا بھر میں پڑھ رہے ہیں، لیکن منکرین حدیث ہیں کہ خود بدلنے کے بجائے قرآن کو بدلنے پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بالکل ہی بے باک نہ ہوجائے وہ اس کے کلام کے ساتھ یہ مذاق نہیں کرسکتا جو یہ حضرات کررہے ہیں یا پھر قرآن کے ساتھ یہ کھیل وہ شخص کھیل سکتا ہے جو اپنے دل میں اسے اللہ کا کلام نہ سمجھتا ہو اور محض دھوکا دینے کے لیے قرآن قرآن پکار کر مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتا ہو۔ (اس سلسلہ میں آگے حاشیہ ۵۰ بھی ملاحظہ ہو۔)'' (تفہیم ج ۳ سورہ روم حاشیہ ۲۴، ص ۷۴۰-۷۴۲)

تفہیم اور دورِ جدید کا علمی معیار

زندگی اور کائنات کے تعلق سے آج انسانی معلومات جہاں تک پہنچی ہیں اور علم و تحقیق کا جو معیار آج قائم ہے اور دنیا جس زبان کو سمجھتی اور جس اسلوب سے آشنا ہے، سید مودودی اسی معیار، اسی زبان اور اسی اسلوب میں اپنی بات رکھتے ہیں، ان کی یہ خصوصیت ان کی تفسیر میں نمایاں ہے۔

سورہ ق آیت ۶ افلم ينظروا الى السماء فوقهم كيف بنيناها وزيناها ومالها من فروج کا ترجمہ کرتے ہیں ''اچھا تو کیا انھوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے''۔ اس آیت پر پھر مولانا علم کے موتی کس طرح بکھیرتے ہیں ملاحظہ کیجئے۔

”یہاں آسمان سے مراد وہ پورا عالم بالا ہے جسے انسان شب و روز اپنے اوپر چھایا ہوا دیکھتا ہے، جس میں دن کو سورج چمکتا ہے اور رات کو چاند اور بے حد و حساب تارے روشن نظر آتے ہیں جسے آدمی برہنہ آنکھ ہی سے دیکھے تو حیرت طاری ہو جاتی ہے لیکن اگر دوربین لگا لے تو ایک ایسی وسیع و عریض کائنات اس کے سامنے آتی ہے جو ناپیدا کنار ہے، کہیں سے شروع ہو کر کہیں ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ ہماری زمین سے لاکھوں گنے بڑے عظیم الشان سیارے اس کے اندر گیندوں کی طرح گھوم رہے ہیں۔ ہمارے سورج سے ہزاروں درجہ زیادہ روشن تارے اس میں چمک رہے ہیں۔ ہمارا یہ پورا نظام شمسی اس کی صرف ایک کہکشاں (Galaxy) کے ایک کونے میں پڑا ہے، تنہا اسی ایک کہکشاں میں ہمارے سورج جیسے کم از کم تین ارب دوسرے تارے (کواکب) موجود ہیں اور اب تک کا انسانی مشاہدہ ایسی ایسی دس لاکھ کہکشانوں کا پتہ دے رہا ہے۔ ان لاکھوں کہکشانوں میں سے ہماری قریب ترین ہمسایہ کہکشاں اتنے فاصلے پر واقع ہے کہ اس کی روشنی ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چل کر دس لاکھ سال میں زمین تک پہنچتی ہے۔ یہ تو کائنات کے صرف اس حصہ کی وسعت کا حال ہے جو اب تک انسان کے علم اور اس کے مشاہدہ میں آتی ہے۔ خدا کی خدائی کس قدر وسیع ہے، اس کا کوئی اندازہ ہم نہیں کر سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ انسان کی معلوم کائنات اس پوری کائنات کے مقابلے میں وہ نسبت بھی نہ رکھتی ہو جو قطرے کو سمندر سے ہے۔ اس عظیم کارگاہِ ہست و بود کو جو خدا وجود میں لایا ہے، اس کے بارے میں زمین پر رینگنے والا یہ چھوٹا سا حیوان ناطق جس کا نام انسان ہے اگر یہ حکم لگائے کہ وہ اسے مرنے کے بعد دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا تو یہ اس کی اپنی ہی عقل کی تنگی ہے۔ کائنات کے خالق کی قدرت اس سے کیسے تنگ ہو جائے گی۔؟“

”......اپنی اس حیرت انگیز وسعت کے باوجود یہ عظیم الشان نظام کائنات ایسا مسلسل اور مستحکم ہے اور اس کی بندش اتنی چست ہے کہ اس میں کسی جگہ کوئی دراڑ یا شگاف نہیں ہے اور اس کا تسلسل کہیں جا کر ٹوٹ نہیں جاتا۔ اس چیز کو ایک مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ جدید زمانے کے ریڈیائی ہیئت دانوں نے ایک کہکشانی نظام کا مشاہدہ کیا ہے جسے وہ منبع ۳ ج ۲۹۵ (Source 3c,295) کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے متعلق ان کا اندازہ یہ ہے کہ اس کی جو شعاعیں اب ہم تک پہنچ رہی ہیں وہ ۴ ارب سال سے بھی زیادہ مدت پہلے اس میں سے روانہ ہوئی ہوں گی۔ اس بعید ترین فاصلے سے ان شعاعوں کا زمین تک پہنچنا آخر کیسے ممکن ہوتا اگر زمین اور اس کہکشاں کے درمیان کائنات کا تسلسل کسی جگہ سے ٹوٹا ہوا ہوتا اور اس کی بندش میں کہیں شگاف پڑا ہوا ہوتا۔

اللہ تعالیٰ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر کے دراصل یہ سوال آدمی کے سامنے پیش کرتا ہے کہ میری اس کائنات کے اس نظام میں جب تم ایک ذرا سے رخنے کی نشاندہی بھی نہیں کر سکتے تو میری قدرت میں اس کمزوری کا تصور کہاں سے تمہارے دماغ میں آ گیا کہ تمہاری مہلت امتحان ختم ہو جانے کے بعد تم سے حساب لینے کے لیے میں تمہیں پھر زندہ کر کے اپنے سامنے حاضر کرنا چاہوں تو نہ کر سکوں گا۔

یہ صرف امکانِ آخرت ہی کا ثبوت نہیں ہے بلکہ توحید کا ثبوت بھی ہے۔ ۴ ارب سال نوری (Light years) کی مسافت سے ان شعاعوں کا زمین تک پہنچنا اور یہاں انسان کے بنائے ہوئے آلات کی گرفت میں آنا صریحاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کہکشاں سے لے کر زمین تک کی پوری دنیا مسلسل ایک ہی مادے سے بنی ہوئی ہے۔ ایک ہی طرح کی قوتیں اس میں کارفرما ہیں اور کسی فرق و تفاوت کے بغیر وہ سب ایک ہی طرح کے قوانین پر کام کر رہی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ شعاعیں نہ یہاں تک پہنچ سکتی تھیں اور ان آلات کی گرفت میں آ سکتی تھیں جو انسان نے زمین اور اس کے ماحول میں کام کرنے والے قوانین کا فہم حاصل کر کے بنائے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ہی خدا اس پوری کائنات کا خالق و مالک اور حاکم و مدبر ہے۔“ (تفہیم ج ۵ سورہ ق حاشیہ ۷-۸، ص ۱۱۲-۱۱۱)

صاحب تفہیم کا یہ رنگ سورہ نمل حاشیہ ۷۴ ص ۵۹۱-۵۹۰ حاشیہ ۸۰ ص ۵۹۴-۵۹۳ ج ۳، سورہ روم حاشیہ ۲۵-۲۷ ص ۷۴۲ تا ۷۴۹ ج ۳۔ لقمان حاشیہ ۱۳ ص ۱۳-۱۱ ج ۴ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

روزہ کی حقیقت

”من لم يدع قول الزور والعمل به فليس لله حاجة فى أن يدع طعامه و شرابه“ جس شخص نے جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑے۔ (حدیث)

ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری اوران کی تالیف ''السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ'' ایک مطالعہ

محمد صلاح الدین عمری☆

معروف عراقی مؤرخ ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری کی پیدائش ۱۹۴۲ء میں شمالی عراق موصل میں ہوئی۔ یہیں ابتدائی تعلیم سے پری گریجویشن تک کی تعلیم حاصل کی ۔ اس کے بعد ۱۹۶۳ء میں بغداد یونیورسٹی کی کلیۃ التربیۃ سے تاریخ میں گریجویشن اور ۱۹۶۶ء میں تاریخ اسلامی میں ایم اے۔ کیا، ایم ۔اے میں ان کے مقالہ کا موضوع ''طبقات خلیفۃ بن خیاط: دراسۃ وتحقیق'' تھا۔آپ نے تاریخ اسلامی ہی کے موضوع ''موارد الخطیب البغدادی فی تاریخ بغداد'' پر مقالہ پیش کر کے قاہرہ کی عین شمس یونیورسٹی سے ڈاکٹریت کی ڈگری حاصل کی ۔ ایم ۔اے کرنے کے بعد آپ نے بغداد یونیورسٹی کی کلیۃ الآداب میں ۱۹۶۶ء سے تدریسی فرائض انجام دینے شروع کیے، جس کا سلسلہ دس سال تک جاری رہا۔ بعدازاں آپ کی خدمات ''الجامعۃ الاسلامیۃ'' مدینہ منورہ کے اعلیٰ تعلیم کے شعبہ میں بحیثیت صدرشعبہ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۳ء تک جاری رہیں۔ ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۳ء کے دورانیہ میں آپ نے مدینہ یونیورسٹی کی ''المجلس العلمی'' کی صدارت بھی فرمائی۔ مدینہ یونیورسٹی میں تاریخ اسلامی کے پروفیسر 'مجلس مرکز خدمۃ السنۃ والسیرۃ النبویۃ' کے رکن، 'مجمع الملک فھد لطباعۃ المصحف الشریف' کی مجلس علمی کے رکن کی حیثیت سے آپ کی خدمات قابل قدر ہیں۔ آپ کے زیرنگرانی ایم۔اے اور پی ایچ ڈی کے جن طلباء نے اپنے مقالے پیش کیے ان کی تعداد ۶۰ سے متجاوز ہے۔ ان میں بیشتر مقالے مرویاتِ سیرت نبویہ کی توثیق وتحقیق کے موضوع پر ہیں۔ آپ نے قطر یونیورسٹی کی 'کلیۃ الشریعۃ والقانون' میں بھی تدریسی فرائض انجام دیے۔

☆ پروفیسر، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

آپ کی مندرجہ ذیل تالیفات قابل ذکر ہیں، جن سے آپ کی علمی خدمات کی قدر وقیمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

(۱) السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ (دوحصوں میں) جو آپ نے روایات سیرت نبوی کے نقدوتمحیص میں محدثین کے وضع کردہ قواعد کے مطابق مرتب کی ھے۔ مرکز السنۃ والسیرۃ، قطر ۱۹۹۱ء

(۲) العنف فی الحیاۃ الزوجیۃ

(۳) الرسالۃ والرسول، بیروت ۱۹۹۰ء

(٤) المجتمع المدنی فی عهد النبوۃ (خصائصه وتنظیماته الأولی)، المجلس العلمی، جامعة اسلامیة، مدینه منوره، ۱۹۸۳ء

(٥) المجتمع المدنی فی عهد النبوۃ (الجهاد ضد المشرکین)، المجلس العلمی، جامعة اسلامیة، مدینه منوره، ۱۹۸٤ء

(٦) التراث والمعاصرۃ، قطر ۱۹۸٥ء

(۷) الاسلام والوعی الحضاری، بیروت ۱۹۸۷ء

(۸) تراث الترمذی العلمی، مکتبة الدار، مدینه منوره، ۱۹۹۱ء

(۹) مجتمع المدینة فی عصر النبوۃ، مکتبة الدار، مدینه منوره

(۱۰) عصر الخلافة الراشدة

(۱۱) مرویات السیرۃ النبویة بین قواعد المحدثین وروایات الأخباریین

(۱۲) استخدام الحاسب فی العلوم الشرعیة (بحث)

(۱۳) بحوث فی تاریخ السنة المشرقة۔ اس تالیف کے بغداد اور بیروت سے ۱۹٦۷ء، ۱۹۷۲ء، ۱۹۷٥ء اور ۱۹۸٤ء تك چار ایڈیشن شائع هوچکے تهے۔

(١٤) تاریخ خلیفة بن خیاط (تحقیق)، المجمع العراقی العلمی، عراق ۱۹٦۷ء، مؤسسة الرسالة، دمشق ۱۹۷۷ء، مکتبة دارطیبة، ریاض ۱۹۸٤ء

(١٥) طبقات خلیفة بن خیاط (تحقیق)، بغداد ۱۹٦۷ء، مکتبة دار طیبة،

رياض ۱۹۸۳ء

(۱۶) المعرفة والتاريخ، ليعقوب بن سفيان الفسوى (تحقيق، وزارة الأوقاف العراقية، بغداد ۱۹۷٤ء، مؤسسة الرسالة، بيروت ۱۹۷٦ء ، مكتبة الدار، مدينه منوره، ۱۹۸۸ء

(۱۷) أزواج النبى، لمحمد بن زبالة (تحقيق)، المجلس العلمى، الجامعة الاسلامية ۱۹۸۲ء

(۱۸) بقى بن مخلد القرشى ومقدمة مسنده (تحقيق)، بيروت ۱۹۸٤ء

(۱۹) مسند خليفة بن خياط (تحقيق)، بيروت ۱۹۸۵ء

(۲۰) تركة النبى، لحماد اسماعيل الأنصارى (تحقيق)، بيروت ۱۹۸۳ء

(۲۱) دراسات تاريخية مع تعليقة فى منهج البحث وتحقيق المخطوطات— المجلس العلمى، جامعه اسلاميه، مدينه منوره، ۱۹۸۳ء

(۲۲) قيم المجتمع الاسلامى من منظور حضارى

(۲۳) مجال استفادة العلوم الاسلامية من الكمبيوتر (بحث)

(۲٤) منهج النقد عند المحدثين مقارنا بالميثولوجيا العربية (بحث)

(۲۵) موارد الخطيب البغدادى فى تاريخ بغداد (رسالة جامعية)— دمشق سے ۱۹۷۵ء اور بيروت سے ۱۹۸٤ء میں شائع ہوئی۔

آپ کو ۱۹۹۶ء میں دراسات اسلامیہ میں قابل قدر خدمات کے اعتراف میں 'جائزة الملك فيصل العالمية' سے سرفراز کیا گیا۔(۱)

ہمارے پیش نظر ان کی کتاب "السيرة النبوية الصحيحة" ہے، جس میں انھوں نے سیرت رسول ﷺ کو صحت روایات کا خاص لحاظ رکھتے ہوئے تعقید وغموض سے پاک اور صاف و شفاف اسلوب میں پیش کرنے کا التزام کیا ہے۔ ڈاکٹر اکرم ضیاء نے اس کتاب کے مقدمہ میں سیرت نگاری کا مفصل جائزہ لیا ہے اور عمومی طور پر ان سیرت نگاروں کی اس روش پر نقد کیا ہے کہ اکثر سیرت نگار خواہ وہ مؤرخین کے طبقہ سے ہوں یا وہ جو محدث و مؤرخ دونوں کے خصائص سے متصف ہوں، صحت کا لحاظ کیے بغیر سیرت سے متعلق جملہ روایات کو یکجا کر دیتے ہیں اور یہ فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ بیان کردہ اسانید کی بنیاد پر ان کی صحت وعدم صحت کی معرفت حاصل کرے۔ البتہ

بخاری اور مسلم نے اپنی صحیحین میں سیرت کی روایات کے بیان میں صحت کا پورا لحاظ کیا ہے۔

ڈاکٹر عمری نے سیرت نگاری میں محدثین کے منہج کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اس کو اپنانے کی پرزور وکالت کی ہے۔ محدثین کے منہج اور مغربی منہج نقد کا موازنہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ہمارا تاریخی تنقید کا شعور کمزور ہے اور ہماری قدیم کتب تاریخ محض سردِ روایات پر اعتماد کی وجہ سے کسی قسم کی تحلیل اور کلی تصور کا کوئی واضح طریقہ نہیں بتاتیں۔ اسی طرح ہمارے جدید مطالعات بھی روایات کی تحلیل اور ان سے تعامل کے معاملہ میں ناقص ہیں۔(۲)

ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس تالیف کو چار فصلوں میں تقسیم کیا ہے، لیکن ابتدا ایک مبسوط مقدمہ سے کی جس میں سیرت نگاری کی تاریخ اور کتب سیرت کے علمی مقام ومرتبہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ روایت ودرایت کے اعتبار سے اسلامی تاریخ نگاری پر محققانہ نظر ڈالتے ہوئے محدثین کے منہج کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور سیرت نگاری میں اس منہج کو اپنائے جانے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

محدثین کے منہج کی قدر و قیمت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ بعض محققین بالخصوص مستشرقین کی اس رائے کی مدلل اسلوب میں تردید کرتے ہیں کہ مسلم علماء نے روایات کی اسانید کے سلسلہ میں تو تنقیدی رویہ اپنایا ہے، لیکن نقد متون پر توجہ نہیں دی اور تنقیدی عقلیت کے فقدان کی وجہ سے انھوں نے متن کے محاکمہ سے غفلت برتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس حقیقت کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ ایسا مطلقاً نہیں ہے۔ مسلم علماء کی نقدِ اسانید پر اضافی توجہ ہونے کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے متون کے نقد و محاکمہ سے مکمل طور پر غفلت برتی بلکہ انھوں نے اس پہلو پر بھی توجہ دی۔ اس کے شواہد اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ دشوار ہے تاہم نقد متون کے بعض تاریخی محاکمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ابن حزم نے غزۂ اُحد میں مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں بہت سے مصادر کی ذکر کردہ تعداد سے محاکمۂ متن کی بنا پر ہی انکار کیا ہے۔

موسیٰ بن عقبہ نے غزۂ بنی المصطلق ۴ھ میں لکھا ہے جب کہ اکثر سیرت نگار اس کا وقوع ۶ھ میں بتاتے ہیں۔ ابن القیم اور الذہبی نے موسی بن عقبہ کی رائے کو نقد متن کی بنا پر ہی تسلیم کیا ہے۔

قدیم مؤرخین کے مابین غزوۂ ذات الرقاع کے سلسلہ میں محاکمۂ متن کی بنا پر ہی

اختلاف ہے۔ بخاری اس کو خیبر کے بعد تک مؤخر کرتے ہیں۔ جب کہ ابن اسحاق اس کے برخلاف رائے رکھتے ہیں۔ ابن القیم، ابن کثیر اور ابن حجر بخاری کی اتباع کرتے ہیں۔ کیونکہ ابوموسی اشعری اور ابوہریرہؓ اس میں شریک ہوئے تھے اور یہ دونوں نبی ﷺ کی خدمت میں فتح خیبر کے فوراً بعد حاضر ہوئے تھے۔ (۳) صلوۃ الخوف کی تاریخ تشریع کے سلسلہ میں خاصے مباحثے ہوئے ہیں اور یہ مباحثے اکثر محاکمۂ متن کی ہی بنیاد پر ہوئے ہیں۔ (۴)

مقدمہ کے بعد "منہج کتابة تاریخ صدر الاسلام ومصادر السیرة النبویة" کے عنوان سے اسلامی تصور کی اہمیت وضرورت پر مدلل گفتگو کرتے ہوئے، محدثین کے منہج کی اساس پر انھوں نے ازسرنو تاریخ اسلامی کی ترتیب کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے۔ چودہ صدیوں کی مکمل تاریخ اسلام کو ازسرنو ترتیب دینا ایک انتہائی مشکل امر ہے، کیونکہ ایک طرف تو یہ ایک طویل زمانہ ہے، دوسرے مصادر میں اختلاف وتنوع، نیز ابتدا ہی سے سیاسی زندگی میں انحرافی رجحانات، اجتماعی، اقتصادی اور تربیتی پہلوؤں سے اختلافات و انحرافات، پھر بیسوی صدی میں مغربی فکری یلغار کا ایک طویل سلسلہ اور استشراق کے حوالہ سے تاریخ اسلام کے مطالعات میں شدید اور خطرناک قسم کے انحرافات کا نفوذ وغیرہ بھی ایک حقیقت ہے، جس کی وجہ سے تاریخ اسلام کو ازسرنو مرتب کیا جانا انتہائی دشوار عمل ہے اور ڈاکٹر اکرم ضیاء کو اس کا احساس ہے اس لیے انھوں نے اس عمل کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی تو ڈالی ہے لیکن اس کی شدید دشواریوں کے پیش نظر اپنی ترکیز تاریخ صدر اسلام، جس میں سیرت نبویؐ اور عصر خلفائے راشدینؓ شامل ہیں، تک محدود کرتے ہوئے اپنی بات کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کے نزدیک چونکہ اس دور کے مسلمانون کے سلوک و رویہ کے محرکات مین عقیدہ کا قوی اثر ہے، پھر بیشتر مصادر بھی محدثین کے طریقہ کے مطابق روایات کے ساتھ اسانید سے ملتزم رکھے گئے تھے، علاوہ ازیں اس کی اہمیت یوں بھی ہے کہ وہ اسلام کی جامع تعلیمات کی عملی تطبیق کو ممکن بناتا ہے اور ایک ایسا نمونہ ہے جس کی اساس پر ہم آج کی اپنی زندگی کو سنوار سکتے ہیں۔

اسی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر عمری نے "ملامح التصور الاسلامی للتفسیر التاریخی" اور "ضرورة المرونة فی تطبیق قواعد المحدثین فی نطاق التاریخ الاسلامی العام" کے عنوانات کے تحت تاریخ اسلامی کی ترتیب وتنظیم میں اسلامی تصور کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے خدوخال اجاگر کیے ہیں اور تاریخ اسلامی میں منہج محدثین کی اہمیت اور قدروقیمت کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

تاریخی تفسیر کے اسلامی تصور کے خدوخال کو انھوں نے مندرجہ ذیل نکات کے تحت اجاگر کیا ہے:

(۱) قرآن کریم کے ثابت کردہ حقائق کی رعایت ولحاظ مثلاً بشری عقائد کی اصل توحید ہے نہ کہ شرک۔

(۲) صدر اسلام میں مسلمانوں کے سلوک و رویہ کے محرکات کی تفسیر اور اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ مغربی واستشراقی مطالعات کے سلسلہ میں نقد کرتے ہیں۔ چونکہ یہ اسلامی ذوق سے عاری ہوتے ہیں، لہٰذا عمومی طور پر یہ مطالعات صدر اسلام کے مسلموں کے انفرادی و اجتماعی رویوں کے محرکات کو سمجھ نہیں پاتے اور وہ ان کی تفسیر اپنے یوروپی مزاج و احوال کے مطابق کرتے ہیں۔

(۳) حضارت وتہذیب کی قدروقیمت اور اس کے مقام ومرتبہ کا تعین عبادت اللہ سے موافقت کے اعتبار سے کیا جانا، نہ کہ مادی ترقی وتقدم کی بنیاد پر۔

(۴) تاریخ صدر اسلام کی تفسیر میں تبریرعنی وجہ جواز پیدا کرنے کی منطق کو اساس قرار دینے کی منطق سے انکار۔ وہ کہتے ہیں کہ اس منطق نے فکری یلغار کے پیدا کردہ فکری ونفسیاتی دباؤ کے لیے راہ ہموار کی ہے اور اس کے نتیجہ میں معذرت خواہانہ اسلوب نے جنم لیا ہے۔ اس اسلوب کو معاصر مسلم مؤرخین بھی جہاد اور فتوح اسلامیہ کی تحریک کا بیان کرتے وقت استعمال کرتے ہیں اور یہ جواز تلاش کرتے ہیں کہ یہ اقدامات فارس وروم کے اقدامات سے جزیرۂ عربیہ کے دفاع میں تھے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ اس تبریری اسلوب سے غزوات رسول ﷺ بھی محفوظ نہیں رہے۔ اسی ضمن میں قوسین میں وہ شبلی نعمانی کے مطالعۂ سیرت کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ اپنے فضل کے باوجود یہ غلطی کر بیٹھے۔ (۵)

(۵) تاریخی تحریروں میں شرعی اصطلاحات کا استعمال: وہ لکھتے ہیں کہ شرعی مصطلحات قرآن و سنت سے پھوٹنے والے تصور اسلامی کے مطابق ایک محدد، واضح اور دقیق دلالتیں رکھتی ہیں، مثال کے طور پر قرآن کریم نے لوگوں کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے؛ مومن، کافر اور منافق اور ان میں سے تینوں کی مستقل، محدد اور دقیق صفات ہیں اور ان سے کھلواڑ نہیں کیا جاسکتا۔ ان مصطلحات کی جگہ آج کی اصطلاحات "یمینی" (دائیں بازو) اور "یساری" (بائیں بازو) کا استعمال نہیں کیا جاسکتا کہ یہ تو وہ مفہوم ادا کرتی ہیں اور نہ اپنے مفاہیم میں اتنی دقیق اور محدد ہیں جتنی کہ مذکورہ قرآنی

اصطلاحات۔(۶)

(۶) اسی تصور اسلامی کے تحت انھوں نے مصادر سیرت کی ایک فہرست مرتب کر کے ان کی قدر و قیمت اور ان کے استعمال کی کیفیات پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ مصادر قوت و ضعف اور اُصالۃ و وضع کے اعتبار سے چونکہ مختلف ہیں لہٰذا ان سب کو ایک درجہ میں نہیں رکھا جاسکتا۔ کسی آیت قرآنیہ یا حدیث صحیح سے اگر کتب تاریخ وادب کی کوئی روایت متعارض ہے تو ظاہر ہے کہ وہ روایت قابل قبول نہیں۔(۷) حاشیہ پر وہ لکھتے ہیں کہ اس قسم کی غلطی اَبوریہ نے اپنی تالیف ''اُضواء علی السنۃ المحمدیۃ'' میں کی ہے اور اس پر مصطفٰی السباعی نے ''السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی'' میں تنبیہ کی ہے۔(۸) ڈاکٹر عمری لکھتے ہیں کہ مصادر کی قدر و قیمت کا تعین اور اسی کے مطابق ان کو درجہ دیا جانا لازمی ہے۔

ڈاکٹر عمری نے قرآن کو سیرت نبوی کا اولین مصدر قرار دیتے ہوئے محمد عزت دروزہ کی کتاب ''سیرۃ الرسول'' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ انھوں نے سیرت رسولؐ سے متعلق آیات قرآنیہ کی تحلیل کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قرآن سے عقیدہ اسلامیہ، شریعت اسلامیہ، احکام اسلام، اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی تشریعات سے متعلق آیات موجود ہیں جن کے مطابق رسول ﷺ نے دولت اسلامیہ کی تنظیم کی۔ عصر رسول ﷺ کے اہم واقعات مثلاً بدر، احد، خندق، حنین کا بھی ذکر ملتا ہے اور ان اہم واقعات کے وقوع پذیر ہونے کے احوال وظروف کا بھی پتہ چلتا ہے، بالخصوص ان نفسیاتی پہلوؤں کا پتہ چلتا ہے جن کو پوری دقیقہ رسی اور صداقت کے ساتھ قرآن کے علاوہ کسی دوسرے مصدر سے معلوم نہیں کیا جاسکتا۔ حجاز میں یہود و مسلمانوں کے مابین کشمکش کا علم بھی قرآن سے ہی ہوتا ہے۔ اقوام ماضیہ اور انبیاء سابقین کا تذکرہ مسلمانوں میں اسلامی تاریخ کے تصور میں وسعت کا سبب بنتا ہے۔ علاوہ ازیں جزیرہ نمائے عرب سے باہر کے احداث و واقعات مثلاً روم و فارس کے درمیان کشمکش کا بیان تاریخ اسلام کے عالمی رنگ کو واضح کرتا ہے۔ چنانچہ مؤرخین نے روم و فارس اور ترک واحباش کی تاریخ پر بھی توجہ دی ہے۔

اپنے اس بیان میں وہ قرآن کی اصل اہمیت کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے اور لکھتے ہیں کہ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن ان تمام واقعات کی تفصیل بھی دیتا ہے کہ قرآن تاریخ کی کتاب نہیں بلکہ دستور حیات ہے۔ آیات کے اسباب نزول اور وقت نزول کے سلسلہ میں اختلافات کی وجہ سے جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان کے سلسلہ میں ان کا موقف ہے کہ صحیح روایات کی تمییز کی

جائے اور تعارض کو دور کیا جائے۔

قرآن سے مکمل استفادہ کے لیے معتبر کتب تفسیر خاص طور پر تفسیر طبری اور تفسیر ابن کثیر جیسی تفسیر بالماثور پر توجہ دی جانی چاہیے۔ اسی طرح ناسخ ومنسوخ کی کتب، اسباب نزول کے موضوع پر لکھی جانے والی کتب اور وہ تمام کتب جو علوم قرآن سے متعلق ہیں سیرت کے مصادر میں شمار کی جانی چاہییں۔

ڈاکٹر عمری ان لوگوں پر سخت نقد کرتے ہیں جو اسالیب لغت میں اپنے مخصوص ذوق کے مطابق کسی خاص نتیجہ کو برآمد کرنے میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کرتے رہتے ہیں اور بڑی غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں مثلاً مستشرقین نے **''هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم''** کی تفسیر کرتے ہوئے لفظ امیت سے جہل بالدین مراد لیا ہے نہ کہ جہل بالکتابۃ۔ جب کہ قرآن نے نبی کا وصف بیان کرتے ہوئے ''النبی الاُمی'' کہا ہے اور یہ بات معقول نہیں کہ نبی دین سے ناواقف ہو۔(۹) علمی دیانت کا تقاضا ہے کہ معتبر کتب تفسیر سے رجوع کر کے قرآنی نصوص کو صحیح اور مراد معنی ہی دیے جائیں اور ذاتی خواہش یا کسی مسلک ورائے کی تائید کے لیے تاویلات سے کام نہ لیا جائے نبی ﷺ نے خبردار کیا ہے کہ **''من قال فی القرآن برأیه أو بما لا یعلم فلیتبوأ مقعده من النار''**(۱۰)

سیرت نبوی کے مصادر میں حدیث کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ احادیثِ احکام سے جہاں عبادات اور شریعت اسلامیہ کی پوری تصویر اجاگر ہوتی ہے، وہیں عہد نبوی کے انتظامی، ثقافتی، اجتماعی اور اقتصادی نظام پر احادیث سے بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ صحیح بخاری میں مغازی وسیر کے لیے مخصوص حصہ سیرت نبویؐ کی صحیح معلومات کا ذریعہ ہے۔ کتب احادیث میں سیرت سے متعلق جملہ معلومات بالخصوص کتب صحیحہ میں مذکور سیرت سے متعلق مواد کتب مغازی و تاریخ کے مقابلہ میں معتبر تر ہے۔ کیونکہ محدثین نے احادیث کی چھان پھٹک کرنے میں انتہائی احتیاط اور محنت شاقہ سے کام لیا ہے اور جس قسم کے نقد و تدقیق کی ہے وہ عام مؤرخین کے یہاں مفقود ہے۔

لیکن کتب احادیث چونکہ یا تو رواۃ کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہیں مثلاً کتب مسانید جن میں مسند امام احمد بن حنبل اہم تر ہے، اور یا موضوعات کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہیں مثلاً کتب ستہ، لہٰذا ان دونوں ترتیبوں میں زمانہ کی رعایت نہیں رکھی گئی ہے اس لیے محقق کے لیے زمانہ کی تحدید ایک مشکل امر ہے جس کی تلافی کسی نہ کسی حد تک کتب سیر و تاریخ سے ہو جاتی ہے۔ حدیث کی اولین جامع کتب

میں مؤطا امام مالک، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند احمد بن حنبل ہیں۔

ان کتب کے ذکر کے بعد ڈاکٹر عمری نے کتب دلائل یعنی جو صدق نبیﷺ کی دلالتوں اور معجزات کے بیان میں ہیں، کا مصادر سیرت کے ضمن میں ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگرچہ علامات نبوت، آیات نبوت، دلائل نبوت اور خصائص رسولﷺ کے موضوعات کتب حدیث میں شامل ہیں۔لیکن جن محدثین نے ان ابواب کو علاحدہ سے موضوع بنا کر احادیث کے مجموعے مرتب کیے ان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے(۱۱)، اسی طرح شمائل نبیﷺ کے موضوع پر ترتیب دی جانے والی کتب کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے(۱۲)، ساتھ ہی اپنی تحقیق کی رو سے ہر تالیف و ترتیب کی علمی قدر و قیمت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

کتب سیرت کا درجہ قرآن اور کتب حدیث کے بعد ہے اور چونکہ اس کا سلسلہ تابعین کی نسل میں شروع ہو گیا تھا، صحابۂ کرامؓ موجود تھے اور کسی صحابیؓ رسولؐ نے سیرت نگاروں کی کاوشوں کی نکیر نہیں کی۔صحابہ کرامؓ کو سیرت نبوی کا وسیع اور دقیق علم تھا۔محبت رسولﷺ اور اتباع رسولﷺ کی رغبت نے ان کے اندر رسولﷺ کے احکام و ہدایات کو یکجا کرنے اور محفوظ کرنے کا داعیہ پیدا کیا تھا۔ اسلامی تعلیمات کی عملی تطبیق ہی یہ تھی کہ وہ احکام و احادیث رسولﷺ کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھال لیں، لہٰذا انھوں نے سیرت رسولﷺ کی تفصیلات کو معلوم کرنے اور ان کو محفوظ کرنے کا خاص اہتمام کیا تھا۔ چنانچہ سیرت کے موضوع کا اہتمام کرنے والے صحابہ کرامؓ میں عبداللہ بن عباس، عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص اور البراءؓ بن عازب مشہور ہیں۔(۱۳) وہ لکھتے ہیں کہ ابتدا ہی سے اس موضوع پر توجہ دیے جانے سے اس کی تحریف، مبالغہ، تہویل (دہشت انگیزی) اور ضیاع کے امکانات بڑی حد تک کم ہو گئے۔(..........جاری)

☆☆☆

مصادر و مراجع: (۱) ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری کی حیات و خدمات سے متعلق جملہ تفصیلات ہم نے انٹرنیٹ پر متعلقہ سائٹس اور ان کی تالیف ''السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ'' جزء اول کے آخر میں دی گئی ان کی فہرست تالیفات سے اخذ کی ہیں۔
(۲) اکرم ضیاء عمری: السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ، ص:۱۳-۱۴ (۳) ایضاً ص۱۵ (۴) ایضاً ص۱۶ (۵) ایضاً ص۳۷ (۶) ایضاً ص۳۸ (۷) ایضاً ص۴۷ (۸) ایضاً ص ۴۷ بحوالہ مصطفیٰ السباعی: السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی ص۲۹۳-۲۹۴ (۹) ایضاً ص۴۹ بحوالہ صبحی صالح: علوم الحدیث ص۱۵-۱۶ (۱۰) ایضاً ص۴۹ بحوالہ مقدمہ تفسیر ابن کثیر (۱۱) ایضاً ص۵۱-۵۲ (۱۲) ایضاً ص۵۲-۵۳ (۱۳) ایضاً ص۵۳ بحوالہ طبقات ابن سعد۲۹۲/۵، مسند احمد۹/۲،۷ وغیرہ

قرآنی اسالیب دعوت (۷)

مقبول احمد فلاحی

(۳۷) استعانت بالصبر والصلوٰۃ

(ثابت قدمی، مستقل مزاجی، استقلال و استمرار، تعلق باللہ، دعاء، مناجات، روحانی قوت وغیرہ)

قرآن نے راہ حق کے مسافر کے لیے صبر اور نماز سے سہارا لینے کی تلقین کی ہے۔راہ حق کی نہایت اہم منزل دعوت الی اللہ ہے۔یہ اس راہ کی ابتدائی اور آخری منزل ہے۔ہر مرحلہ پر یہ فریضہ انجام دینا ہوتا ہے۔لہٰذا داعی کو ہمیشہ ان بنیادی ہدایات کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے اور اپنے کاموں میں ان دونوں چیزوں سے غذا حاصل کرتے رہنا چاہیے۔

صبر کے معنی ہیں ثابت قدمی، مستقل مزاجی، استقلال و استمرار، مخالفانہ حرکتوں پر غضبناک نہ ہونا، اور ہوش و خرد کے دامن کو کسی لمحے ترک نہ کرنا۔ظاہر ہے اپنی بات ایسے فرد تک پہنچانی ہے جو اس سے نا مانوس ہے۔اور اپنی اس اجنبیت کا جواب وہ مختلف انداز سے دے سکتا ہے۔اگر صبر کی صفت داعی کے اندر ہوگی تو بلا شبہ دیر یا سویر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا بصورت دیگر پہلے ہی مرحلہ میں ناکام ہو جائے گا۔

اسی طرح نماز کا معاملہ ہے۔نماز دراصل روحانی قوت اور تعلق باللہ کی علامت ہے۔اور روحانی قوت داعی کا عظیم ترین سرمایہ ہے۔بسا اوقات داعی بظاہر کوئی دعوت نہیں دیتا ہے مگر اس کے وجود سے پھوٹنے والی روحانی کرنیں لوگوں کے دل و دماغ کو روشن کر دیتی ہیں۔قدم قدم پر ایسے مواقع آتے ہیں کہ اپنی کم مائیگی کے سبب تھک ہار کر ہمت توڑ بیٹھتا ہے مگر اصل سرچشمۂ قوت ذات باری تعالیٰ سے قلبی لگاؤ ہر آن اس کے اندر نئی تازگی اور نئی قوت پیدا کر دیتی ہے۔اور وہ ہر دم رواں دواں نئے تگ و تاز کے ساتھ اپنا کام جاری رکھتا ہے۔کیونکہ اس کے دل و دماغ میں جلوۂ ذات کی تجلیاں کوندتی رہتی ہیں اور محبوب کی رضا کے لیے ساری قوت حیات لٹا کر بھی اسے تشفی نہیں

ہوتی۔ ,,یا ایھا الذین اٰمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ ان اللہ مع الصابرین،، اے مومنو(اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں) صبرونماز کے ذریعہ قوت حاصل کرو۔بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔(البقرۃ ۱۵۳)

(۳۸)تعلق باللہ سورہ مزمل کے آئینے میں۔

اللہ سے تعلق جتنا زیادہ گہرا اور مضبوط ہوگا اسی تناسب سے فرائض کی ادائیگی میں سہولت اور برکت ہوگی۔حضرت محمدﷺ کو کارِنبوت تفویض کرتے وقت اللہ تعالیٰ نے سورۂ مزمل نازل فرما کر بطور خاص درج ذیل امور کی انجام دہی کی تلقین فرمائی لہٰذا ہر وہ فرد جو کارِنبوت کی انجام دہی کے لیے اٹھے اسے ان باتوں کا التزام کرنا چاہیے۔

۱۔تہجد:۔ تعلق باللہ کا اہم ترین ذریعہ قیام لیل(تہجد) کا اہتمام ہے۔رات کی تنہائیوں میں جب مالک کل کے حضور آہ وزاری،مناجات اور فریاد ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کا دست رحمت آپ کو سہارا دیتا ہے اور ذمہ داریوں کی ادائیگی آسان اور سہل ہو جاتی ہے۔

۲۔ذکر:۔ تعلق باللہ کے لیے اس بات کی کوشش ہونی چاہیے کہ قلب وزبان ہمہ آن ذکر الٰہی سے تر رہے۔شبانہ روز کے اذکار ووظائف کا التزام کیا جائے۔دل کسی لمحہ یاد الٰہی سے غافل نہ ہونے پائے۔مختلف اوقات کے اذکار مسنونہ یاد کر لیے جائیں اور ایک ترتیب کے ساتھ انہیں وظیفۂ حیات بنالیا جائے۔

۳۔تلاوت:۔ اللہ سے تقرب کا اہم ترین وسیلہ اس کی کتاب سے لگاؤ ہے۔قرآن میں ڈوب کر حالت وجد میں ترتیل قرآن کا ذائقہ ناقابل بیان ہے۔قرآن کی معیت اللہ کی معیت کے مثل ہے۔

۴۔سبح طویل:۔زندگی میں فرائض منصبی کی ادائیگی کے بغیر تہجد،اذکار ونوافل،ترتیل وتلاوت میں جان نہیں آسکتی۔یہ سب کچھ اسی لیے تو ہے کہ محبوب کی رضا کے حصول کی تڑپ پیدا ہو اور یہی تڑپ دعوت دین کے لیے بے قرار کردیتی ہے۔

۵۔توکل:۔ توکل ایمان باللہ کی ایک اہم منزل ہے۔اللہ سے وابستگی کے ساتھ یہ صفت ضرور پیدا ہونی چاہیے کہ آدمی راضی برضا ہو جائے۔اور اللہ کے فیصلہ پر مکمل بھروسہ کرنے لگے ایک وفادار غلام کی طرح جان توڑ کر اپنا کام کرے اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دے۔بلاشبہ اس کی حکمت کا راز اسی پر عیاں ہے۔

۶۔صبر:۔ ہر طرح کے حالات وظروف سے بے نیاز ہو کر کام کیا جائے۔حالات کی نامساعدت کو ڈھال بنا کر پہلو تہی نہ اختیار کی جائے۔ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ ہمیشہ مورچہ بند رہا جائے۔

۷۔ھجر جمیل:۔ مخاطبین کی جانب سے انتہائی نامناسب رویہ پیش آنے پر حکمت کے ساتھ پہلو تہی اختیار کرلی جائے۔نامناسب ردعمل سے آگے اپنا کام جاری رکھ کر آئندہ کے لیے دعوت کا راستہ نہ مسدود کیا جائے۔ادفع بالتی ھی احسن بھی اس عمل کا حصہ ہے۔

۸۔اقامت صلوٰۃ:۔ ظاہری وباطنی تمام آداب کے ساتھ نماز کا اہتمام والتزام مومن کی طاقت وہمت کا سرچشمہ ہے۔اس سے غافل ہونے پر ساری عمارت کی چول ڈھیلی ہو جاتی ہے۔نماز مومنانہ اور داعیانہ زندگی کے بقاوتحفظ کا پائیدار اور نفیس لباس ہے۔

۹۔ایتائے زکوٰۃ:۔ جوہر تقویٰ کی آبیاری،اور تزکیہ نفس کے لیے قلوب کے اندر سے مال کی محبت کا نکلنا ضروری ہے۔ہمارے پاس مال اللہ کی امانت ہے اس مال کو اس کے حقیقی مالک کے اشارے پر نچھاور کرنا ہمارا کام ہے۔

۱۰۔اقراض اللہ:۔ ہر وہ شے جس پر اللہ نے ہمیں تصرف کا حق دیا ہے مکمل طور پر اسی کے حوالے کردیا جائے۔اللہ کے دین کی اقامت اور نصرت کے لیے بے دریغ خرچ کردینے کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

۱۱۔استغفار:۔ جان دی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔شعوری اور غیر شعوری طور پر اتنی تقصیرات کا صدور ہوتا رہتا ہے کہ اگر مولائے کریم کی دامن رحمت کی پناہ گاہ نہ ہو تو ہلاکت وبربادی یقینی ہے۔

(۳۹)حسن سلوک۔

مولانا صدرالدین اصلاحیؒ نے اپنی تفسیر تیسیر القرآن میں سورہ بقرہ آیت ۸۲،کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے ''اسلامی ضابطۂ معاشرت واخلاق کی یہ ایک بنیادی دفعہ ہے کہ ہر انسان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرو۔تعلقات کے مدارج کا لحاظ اس سلوک میں تو ضرور کرنا چاہیے لیکن دنیا کا ہر انسان قطع نظر اس سے کہ اس کا نام،وطن،مذہب،عقیدہ کیا ہے اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اس کے ساتھ بھلا سلوک،انسانیت اور مروت کا سلوک کیا جائے۔چنانچہ اس آیت میں ترتیب وار جن لوگوں کا ذکر آیا ہے ان میں سے کسی کے ساتھ مسلم وغیر مسلم کی کوئی قید نہیں لگائی گئی ہے۔بلکہ عام حکم

دیا گیا ہے۔ یہ وہ احکام ہیں جو ہمیشہ سے اسلامی نظام معاشرت کی ریڑھ کی ہڈی رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ کیا حضرت آدم کے زمانہ سے ہر داعیٔ اسلام ان ہی بنیادوں پر انسانیت کی تعمیر کرتا رہا ہے۔" (ص۱۲۳)

حقوق العباد اسلامی تعلیمات کا اہم حصہ ہے اور یہ حصہ حسن سلوک کا شاہکار ہے۔ والدین، اولاد، دور و نزدیک کے اعزہ و اقارب، پڑوسی، مسافر، مستقل ہمراہ، عارضی ساتھی، غرضیکہ سماج کے ہر طبقہ کے لیے واضح حقوق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ حقوق کے تعین میں نہ صرف کامل عدل و توازن کو مدنظر رکھا گیا ہے بلکہ آگے اپنے حقوق سے دست بردار ہو کر دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔

بلاشبہ حسن سلوک انسانی کردار کا وہ روشن باب ہے جس نے ہمیشہ انسانی قلوب کو مسخر کیا ہے۔ یہ براہ راست انسانی قلب پر دستک دیتا ہے۔ اور وہاں اپنے لیے جگہ بنالیتا ہے۔ اس کی ضرب اتنی کاری ہوتی ہے کہ سخت سے سخت دل انسان متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مخاطب کو رام کرنے اور ہم نوا و ہم فکر بنانے میں دعوت کے اس عملی اسلوب کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ سیدنا حضرت محمد ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی سیرتوں میں بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ داعی کو ان سے استفادہ کرتے رہنا چاہیے۔

"واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لا تعبدون الا اللہ، و بالوالدین احساناً و ذی القربیٰ والیتٰمیٰ والمساکین وقولوا للناس حسناً واقیموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ، ثم تولیتم الا قلیلاً منکم وانتم معرضون ۔ یاد کرو، اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا، لوگوں سے بھلی بات کہنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا مگر تھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے اور اب تک پھرے ہوئے ہو۔ (البقرۃ ۸۳)

(۴۰) **ادفع بالتی ھی احسن** (دفاع احسن)

یہ حسن سلوک کے آگے کی منزل یا حسن سلوک کا دوسرا پہلو ہے۔ حسن سلوک تو یہ ہوا کہ بربنائے انسانیت انسانی روابط کے حقوق خوشدلی سے ادا کیے جائیں بلکہ آگے بڑھ کر اپنے حقوق متأثر کر کے دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دینے کی کوشش کی جائے، یہ احسان ہے اور ایک مطلوب صفت ہے۔ مگر قرآن داعی کو اس مقام سے بھی بلند دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ مخاطب تم سے بدسلوکی کرے، تم پر ظلم کرے، تمہیں ناحق ستائے، ہر طرح سے زیادتی کرے اور تم کسی ردعمل،

انتقام، اور جذبات سے مغلوب نہ ہو بلکہ ان حرکتوں کا جواب حسن سلوک سے دو۔ گالی دینے والوں کو دعائیں دو۔ بدخواہوں کے ساتھ خیرخواہی کا معاملہ کرو۔ ان کی نادانیوں پر ترس کھاؤ۔ ان کی بے راہ روی تم کو مضطرب کردے۔ یہ ناسمجھ ہیں نادان ہیں، ہلاکت و بربادی کی طرف جارہے ہیں۔ تم شعور رکھتے ہو تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا یہ نادان بھائی جہنم سے قریب تر ہوتا جارہا ہے۔ اس کی زیادتیاں اس کے لیے باعث ہلاکت و بربادی ہیں۔ وہ غضب خداوندی کو دعوت دے رہا ہے۔ تمہاری انسانیت دوستی اور اعلیٰ ظرفی متقاضی ہے کہ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی ایسا ردعمل نہ ظاہر کرو کہ یہ مزید تباہی کی طرف بڑھ جائے۔ تمہارا مقام بہت بلند ہے تم وہ دیکھ رہے ہو جو اسے نظر نہیں آرہا ہے۔ لہٰذا برائی کا جواب برائی سے نہ دو۔ مخالفانہ طرز عمل کے باوجود تمہارا رویہ خیرخواہانہ رہنا چاہیے۔ یہ رویہ مخاطب کے اندرونی خبث کو جلا کر راکھ کردینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس سے قساوت قلبی بھی ہل جاتی ہے۔ اگر اس کے اندر زندگی کی کچھ بھی رمق ہے تو تمہارا یہ بلند رویہ مخاطب کو تمہارے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کردے گا۔

سورہ حٰمٓ سجدہ میں نہایت صراحت کے ساتھ اس حکمت عملی کو اپنانے کی تلقین کی گئی ہے۔

"ومن احسن قولاً ممن دعا الیٰ اللہ و عمل صالحاً و قال اننی من المسلمین، ولا تستوی الحسنۃ ولا السئیۃ، ادفع بالتی ھی احسن، فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم، وما یلقٰھا الا الذین صبروا و ما یلقٰھا الا ذو حظ عظیم." "اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اور اے نبیؐ نیکی اور بدی یکساں نہیں ہے۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں۔ (۳۳،۳۴،۳۵،)" **ادفع بالتی ھی احسن السئیۃ، نحن اعلم بما یصفون"** اے نبی، برائی کو اس طریقے سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ جو کچھ باتیں وہ تم پر بناتے ہیں وہ ہمیں خوب معلوم ہیں (المؤمنون ۹۶)

☆☆☆

قومِ یہود اور امنِ عالم (۱)

فریدالدین فلاحی☆

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو بھیجتے وقت تاکید کی تھی کہ جو کوئی ہدایتِ الٰہی کی پیروی کرے گا وہ کامیاب اور جو انکار کرے گا وہ ناکام ونامراد ہوگا۔ پھر وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا۔

قلنا اھبطوا منھا جمیعاً، فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ والذین کفروا وکذبوا بآیاتنا اولٰئك اصحاب النار ھم فیھا خالدون (اور ہم نے کہا ''تم سب یہاں سے اتر جاؤ، پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔)(۱)

چنانچہ جب بھی انسانیت راہِ راست سے بھٹکی اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف رسول بھیجے تاکہ انھیں راہِ راست کی طرف رہنمائی کرے اور ہر قوم کے پاس انھیں بھیجا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

انا ارسلناك بالحق بشیراً ونذیراً وان من امة الا خلا فیھا نذیر (اے نبی ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر اور کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔)(۲)

اسی طرح انبیاء ورسل کا سلسلہ جاری رہا اور اللہ تعالیٰ نے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کو رہتی دنیا تک کے لیے بھیجا، تمام نسل انسانی کے لیے آپؐ داعی، معلم اور مربی تھے، مگر یہ یہود ونصاری کو قبول نہ تھا۔ صرف اس لیے کہ آپ بنی اسماعیل میں تشریف لائے، نہ کہ بنی اسرائیل میں۔ حالانکہ وہ آپ کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ وہ اگر آپ کی دعوت پر ایمان لے آتے تو ان ہی کے حق میں بہتر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ یَا أَیُّھَا النَّاسُ إِنِّیْ رَسُولُ اللّٰہِ إِلَیْکُمْ جَمِیْعاً الَّذِیْ لَہُ مُلْکُ السَّمَاوَاتِ

☆ ریاض، سعودی عربیہ

وَالأَرْضِ لا إِلَـٰہَ إِلاَّ ھُوَ یُحْیِـیْ وَیُمِیْتُ فَآمِنُواْ بِاللّٰہِ وَرَسُولِہِ النَّبِیِّ الأُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَکَلِمَاتِہِ وَاتَّبِعُوہُ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُونَ (اے محمد کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین اور آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اس کے بھیجے ہوئے نبی امی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات کو مانتا ہے اور پیروی اختیار کرو اس کی، امید ہے کہ تم راہِ راست پالوگے)(۳)

یہ حکم تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اللہ ایک ہے، دین اسلام ایک ہے تمام انبیاء کا پیغام ایک ہے اور آخری نبی کا تذکرہ بھی پچھلی کتابوں میں ہے اور ان پر ایمان لانا ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ رب العالمین کا فرمان ہے: الَّذِیْنَ یَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِیَّ الأُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُونَہُ مَکْتُوباً عِندَھُمْ فِیْ التَّوْرَاةِ وَالإِنْجِیْلِ یَأْمُرُھُم بِالْمَعْرُوفِ وَیَنْھَاھُمْ عَنِ الْمُنکَرِ وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبَاتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبَآئِثَ وَیَضَعُ عَنْھُمْ إِصْرَھُمْ وَالأَغْلاَلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ فَالَّذِیْنَ آمَنُواْ بِہِ وَعَزَّرُوہُ وَنَصَرُوہُ وَاتَّبَعُواْ النُّورَ الَّذِیْ أُنزِلَ مَعَہُ أُوْلَـٰئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُونَ (پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر، نبی امی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے یہاں توریت اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں، اس کی حمایت ونصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے وہی فلاح پانے والے ہیں۔(۴)

بنی اسرائیل کی مختصر تاریخ

حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل تھا، ان کی اولاد کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کے اہل خانہ کنعان سے مصر آئے اور یہیں آباد ہوئے۔ تقریباً ایک صدی بعد مصر میں ایک قوم پرستانہ انقلاب آیا اور قبطیوں کی قوم پرستانہ حکومت نے پہلے ان کی زمینوں پر سے بے دخل کردیا، تمام اونچے عہدے چھین لیے، محنت مزدوری اور بیگاری لینے لگے یعنی ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور کردیا (یسومونکم سوء العذاب) ایسے میں اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم میں حضرت موسیٰؑ کو مبعوث فرمایا تاکہ ان کی کھوئی ہوئی عزت بحال کرے۔ پھر ان پر کتاب نازل کی اور اس کے فیض سے وہی دبی اور پسی ہوئی قوم ہدایت پاکر دنیا میں ایک نامور قوم بن گئی۔(۵)

جب ۷۰ء میں رومیوں نے فلسطین میں یہودیوں کا قتل عام کیا، پھر ۱۳۲ء میں انھیں اس سرزمین سے نکال باہر کیا اسی دور میں بہت سے یہودی قبائل بھاگ کر حجاز میں پناہ گزیں ہوئے تھے،

یہ علاقہ فلسطین کے جنوب میں متصل ہی واقع تھا۔ یہاں آکر انھوں نے جہاں جہاں چشمے اور سرسبز مقامات دیکھے وہاں ٹھہر گئے اور پھر رفتہ رفتہ اپنے جوڑتوڑ اور سودخوری کے ذریعہ ان پر قبضہ جمالیا۔ ایلہ، مقنا، تبوک، تیمہ، وادی القریٰ، فدک اور خیبر پر اس کا تسلط اسی دور میں قائم ہوا اور بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی بہدل اور بنی قینقاع بھی اسی دور میں آکر یثرب پر قابض ہوگئے۔ ان میں بنی نضیر اور بنی قریظہ ممتاز تھے۔ یہ لوگ جب آباد ہوئے اس وقت کچھ دوسرے عرب قبائل یہاں رہتے تھے جن کو انھوں نے دبالیا اور عملاً اس سرسبز وشاداب مقام کے مالک بن گئے۔ اس سے تین صدی بعد تقریباً ۴۵۰ء میں ایک زبردست سیلاب سے متاثر ہوکر قومِ سبا کے قبائل یمن سے نکل کر اطرافِ عرب میں پھیل جانے پر مجبور ہوئے۔ ان میں سے اوس وخزرج یثرب (مدینہ) میں آکر آباد ہوئے۔ چونکہ یہاں یہود قابض تھے، اس لیے وہ پہلے تو بنجر علاقہ میں آبسے، پھر بعد میں اپنے غسانی بھائیوں کی مدد سے جو شام میں جاکر آباد ہوئے تھے یثرب پر غلبہ حاصل کرلیا اور بنونضیر وبنی قریظہ شہر کے باہر جنوب مشرقی علاقہ میں آباد ہوئے۔ تیسرا قبیلہ بنی قینقاع جس کی ان دونوں قبیلوں سے ان بن تھی، اسی لیے وہ شہر کے اندر مقیم رہے۔ اس طرح اس قبیلہ کو خزرج کی پناہ لینی پڑی اور باقی دونوں قبیلے اوس کی پناہ میں آئے تاکہ سکون کی سانس لے سکیں۔ (۶)

نبی اکرم ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو اطرافِ مدینہ کے تمام قبائل کے ساتھ ساتھ ان یہودیوں سے بھی امن کا معاہدہ کرلیا تھا تاکہ تمام لوگ امن وسکون کی زندگی بسر کرسکیں اور پرامن ماحول میں دعوت وتبلیغ کا کام جاری رہے۔

بنی قینقاع

یہودیوں میں پہلا قبیلہ جس نے اجتماعی طور پر غزوۂ بدر کے بعد کھلم کھلا اپنا معاہدہ توڑ دیا، وہ بنی قینقاع تھا۔ یہ لوگ شہر مدینہ کے اندر ایک محلّہ میں آباد تھے۔ چونکہ یہ سنار، لوہار اور ظروف ساز تھے اس لیے ان کے بازار میں اہل مدینہ کو کثرت سے آنا جانا پڑتا تھا۔ ان کو اپنی شجاعت پر بہت ناز تھا۔ آہن گر ہونے کی وجہ سے ان کا بچہ بچہ مسلح تھا۔ سات سو مردانِ جنگ ان کے اندر موجود تھے۔ ان کو اس بات کا بھی زعم تھا کہ قبیلہ خزرج سے ان کے پرانے حلیفانہ تعلقات تھے اور خزرج کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول ان کا پشتیبان تھا۔ بدر کے واقعہ سے اس قدر مشتعل ہوئے کہ انھوں نے بازار میں آنے جانے والے مسلمان کو ستانا اور خاص طور پر ان کی عورتوں کو چھیڑنا شروع کردیا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دن ان کے بازار میں برسرِ عام ایک مسلمان عورت کو برہنہ

کردیا گیا جس پر سخت جھگڑا ہوا۔ اس ہنگامہ میں ایک مسلمان شہید اور ایک یہودی قتل ہوگیا۔ جب صورتِ حال اس حد تک پہنچی تو رسول اللہ ﷺ ان کے محلّہ میں تشریف لے گئے اور انھیں جمع کرکے سب کو راہِ راست پر آنے کی تلقین کی۔ اس پر انھوں نے جواب دیا: ''اے محمدؐ! تم نے شاید ہمیں بھی قریش سمجھا ہے؟ وہ لڑنا نہیں جانتے تھے اس لیے تم نے انھیں مارلیا ہے، ہم سے سابقہ پیش آئے تو تمھیں معلوم ہوجائے گا کہ مرد کیسے ہوتے ہیں؟'' یہ گویا صاف صاف اعلانِ جنگ تھا۔

آخرکار نبی اکرم ﷺ نے شوال (بروایت بعض، ذی قعدہ) ۲ھ کے آخر میں ان کے محلّہ کا محاصرہ کرلیا۔ صرف ۱۵/دن ہی محاصرہ رہا تھا کہ انھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ان کے جوان قیدی بنالیے گئے، عبداللہ بن ابی بن سلول ان کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اصرار کیا کہ آپ انھیں معاف کردیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے ان کی درخواست قبول کرتے ہوئے یہ فیصلہ فرمادیا کہ بنی قینقاع اپنا تمام مال واسباب اور اسلحہ چھوڑ کر مدینہ سے نکل جائیں۔ چنانچہ وہ شام کی طرف چلے گئے۔

بنی نضیر

۳ھ میں معرکہ احد میں مسلمانوں کو نقصانِ عظیم ہوا تو بنی نضیر کی جرأتیں مزید بڑھ گئیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کی باقاعدہ سازش کی جو عین وقت پر ناکام ہوگئی۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ صفر ۴ھ بئر معونہ کے سانحہ کے بعد عمرو بن امیہ صخری نے انتقامی کارروائی کے طور پر غلطی سے بنی عامر کے دو افراد کو قتل کردیا جو دراصل معاہدہ قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ عمرو نے ان کو دشمن قبیلہ کا آدمی سمجھ لیا تھا۔ اس غلطی کے سبب ان کا خوں بہا مسلمانوں پر واجب ہوگیا، چونکہ بنی عامر کے ساتھ معاہدہ میں بنی نضیر بھی شریک تھے، اس لیے حضور اکرم ﷺ چند صحابہ کے ساتھ خود ان کی بستی میں تشریف لے گئے تاکہ خوں بہا کی ادائیگی میں ان کو بھی شرکت کی دعوت دیں۔ وہاں انھوں نے آپ کو چکنی چپڑی باتوں میں لگایا اور اندر ہی اندر سازش کی کہ ایک شخص اس مکان کی چھت پر سے آپ کے اوپر ایک بھاری پتھر گرادے جس کی دیوار کے سائے میں آپ تشریف فرما تھے۔ قبل اس کے کہ وہ اپنی تدبیر پر عمل کرتے، اللہ تعالیٰ نے بروقت آپ کو خبردار کردیا۔ آپ ﷺ فوراً وہاں سے اٹھ کر مدینہ واپس تشریف لائے۔ اب ان کے ساتھ کسی رعایت کا سوال نہ تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے ان کو بلاتاخیر یہ الٹی میٹم بھیج دیا کہ 'تم نے غداری کرنی چاہی تھی وہ میرے علم میں آگئی ہے، لہٰذا دس دن کے اندر تم سب مدینہ سے نکل جاؤ۔ اس کے بعد تم اگر یہاں ٹھہرے رہے تو جو شخص بھی

تمھاری بستی میں پایا جائے گا اس کی گردن ماردی جائے گی‘۔دوسری طرف عبداللہ بن ابی بن سلول نے ان کو پیغام بھیجا کہ میں دوہزار آدمیوں سے تمھاری مدد کروں گا اور بنی قریظہ و بنی غطفان بھی تمھاری مدد کو آئیں گے۔تم ڈٹ جاؤ اور ہرگز اپنی جگہ نہ چھوڑو۔اس جھوٹے بھروسہ پر انھوں نے حضور اکرم ﷺ کے الٹی میٹم کا یہ جواب دیا’’ہم یہاں سے نہیں نکلیں گے، آپ سے جو کچھ ہو سکے کر لیجیے‘‘۔اس پر ربیع الاوّل ۴ھ میں رسول اللہ ﷺ نے ان کا محاصرہ کرلیا۔صرف چند روز کے محاصرہ کے بعد (جس کی مدت بعض روایت میں ۶ دن اور بعض میں ۱۵ دن ہے) وہ اس شرط پہ مدینہ چھوڑ دینے کے لیے راضی ہوگئے کہ اسلحہ کے علاوہ جو کچھ بھی وہ اپنے اونٹوں پر لاد کر لے جاسکیں گے لے جائیں گے۔اس طرح یہودیوں کے اس شریر قبیلے سے مدینہ کی سرزمین خالی کرالی گئی۔ان میں سے صرف ۲ آدمی مسلمان ہوکر یہاں ٹھہر گئے۔باقی ملک شام اور خیبر کی طرف نکل گئے۔(۷)

بنو قریظہ

یہ مدینہ طیبہ کے جنوب مشرقی گوشے میں آباد تھے، چونکہ اس قبیلہ سے مسلمانوں کا باقاعدہ حلیفانہ معاہدہ تھا، جس کی رو سے مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مدافعت کرنے کے پابند تھے۔غزوۂ خندق کے موقع پر مسلمانوں نے اس طرف سے بےفکر ہوکر اپنے بال بچوں کو ان گڑھیوں میں بھیج دیا تھا جو بنی قریظہ کی جانب تھیں اور ادھر مدافعت کا کوئی انتظام نہ کیا تھا۔کفار قریش نے اس کمزور پہلو کو بھانپ لیا اور بنوقریظہ کو ورغلا کر غداری پہ آمادہ کیا۔چنانچہ کفار کے مشترکہ محاذ کا پلہ بھاری دیکھ کر بنوقریظہ بدعہدی پر اتر آئے اور عین لڑائی کے درمیان مسلمانوں سے معاہدہ توڑنے کا اعلان کردیا۔اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔

غزوۂ خندق کے اختتام پر نبی کریمؐ نے بنی قریظہ کے محاصرے کا حکم دیا جو تین ہفتے تک جاری رہا اور آخر کار انھوں نے سعد بن معاذؓ کو فیصلے کے لیے حکم بنایا۔اس بنا پر کہ دور جاہلیت میں بنوقریظہ اور حضرت سعد بن معاذؓ کے قبیلہ اوس کے درمیان حلیفانہ تعلقات تھے۔امید تھی کی وہ ان کے حق میں تعلقات کا لحاظ کرتے ہوئے رعایت سے کام لیں گے۔

حضرت سعد بن معاذؓ دیکھ چکے تھے کہ ان کے پیش رَو دو یہودی قبیلے بنی قینقاع اور بنی نضیر مدینہ چھوڑ کر خیبر اور شام کی طرف چلے گئے تھے، لیکن بعد میں یہی قبائل دس بارہ ہزار کی جمعیت اکٹھا کر کے مسلمانوں کو نیست ونابود کرنے کے لیے مدینہ پہ چڑھ آئے۔چنانچہ انھوں نے ان کی کتاب ’توریت‘ کے حکم کے مطابق بدعہدی کی سزا کا فیصلہ یوں دیا۔

۱-بنی قریظہ کے تمام مردوں کو قتل کردیا جائے۔
۲-عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جائے۔
۳-ان کی تمام املاک مسلمانوں میں تقسیم کردی جائے۔

جب مسلمان ان کی گڑھیوں میں داخل ہوئے تو پتہ چلا کہ جنگ احزاب میں حصہ لینے کے لیے ان غداروں نے ۱۵۰۰ تلواریں، ۱۵۰۰ ڈھالیں، ۲۰۰۰ نیزے اور ۳۰۰ زرہیں فراہم کی تھیں۔اگر اللہ کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو یہ سارے جنگی سامان عین دورانِ جنگ مدینہ کے عقب پر حملہ کرنے میں استعمال ہوتا۔(۸)

یہ بات سامنے آچکی ہے کہ عرب کے یہودی آپؐ کو بحیثیت نبی پہچانتے تھے۔توراۃ میں آپؐ کے سلسلے میں جو بشارتیں تھیں ان کی روشنی میں مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے فوراً بعد انھیں یقین ہوگیا تھا کہ جس نبی کا انتظار ہو رہا تھا وہ یہی ہیں۔ابن اسحاق کا بیان ہے۔

مجھے ام المومنین حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطبؓ سے یہ روایت ملی ہے کہ انھوں نے فرمایا: ’میں اپنے والد اور چچا ابویاسر کی نگاہ میں اپنے والد کی سب سے چہیتی اولاد تھی۔میں چچا اور والد سے جب کبھی ان کی کسی بھی اولاد کے ساتھ ملتی تو وہ اس کے بجائے مجھے ہی اٹھاتے۔جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور قبا میں بنوعمرو بن عوف کے یہاں نزول فرما ہوئے تو میرے والد حیی بن اخطب اور میرے چچا ابویاسر آپؐ کی خدمت میں صبح تڑکے حاضر ہوئے اور غروب آفتاب کے وقت واپس آئے۔بالکل تھکے ماندے گرتے پڑتے لڑکھڑاتی چال چلتے ہوئے۔میں نے حسبِ معمول چہک کر ان کی طرف دوڑ لگائی، لیکن انھیں اس قدر غم تھا کہ وہ دونوں میں سے کسی نے بھی میری طرف التفات نہ کیا اور میں نے اپنے چچا کو سنا وہ میرے والد حیی بن اخطب سے کہہ رہے تھے: کیا یہ وہی ہیں؟

انھوں نے کہا: ہاں! اللہ کی قسم
چچا نے کہا: آپ انھیں ٹھیک ٹھیک پہچان رہے ہیں؟
والد نے کہا: ہاں
چچا نے کہا: اب آپ کے دل میں ان کے متعلق کیا ارادے ہیں؟
والد نے کہا: عداوت۔اللہ کی قسم جب تک زندہ رہوں گا۔(۹)

یوں تو اہل کتاب یہود اور نصاریٰ ہیں اور صرف اپنے کو اہل حق سمجھتے ہیں اور صرف جنت کے حقدار ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَقَالُوا لَن يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْداً اَوْ نَصَارٰی، تِلْکَ اَمَانِيُّهُمْ، قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ (ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہیں جائے گا جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو۔ یہ ان کی تمنائیں ہیں، ان سے کہو اپنی دلیل پیش کرو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔) (۱۰)

اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کو گمراہ قرار دیتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصَارٰی عَلٰی شَیْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارٰی لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰی شَیْءٍ وَهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتَابَ، كَذَالِکَ قَالَ الَّذِيْنَ لَايَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ (یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں، عیسائی کہتے ہیں یہودیوں کے پاس کچھ نہیں۔ حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھتے ہیں۔ اس قسم کے دعوے ان لوگوں کے بھی ہیں جن کے پاس کتاب کا علم نہیں ہے۔) (۱۱)

یہ تیسرا گروہ دراصل مشرکین کا ہے۔ یہ تینوں گروہ اسلام دشمنی میں ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ ان میں سے نصاریٰ ہی اسلام سے قریب تر یا نرم موقف رکھنے والے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا الْيَهُوْدُ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا، وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصَارٰی، ذَالِکَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَايَسْتَكْبِرُوْنَ (تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے کہا ہم نصاری ہیں، یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادگزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرورِ نفس نہیں ہے۔) (۱۲)

چنانچہ یہود کے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ اسلام پھلے پھولے، اسلام کا بول بالا ہو اور ملک امن کا گہوارہ بنے۔ یہود کی اسلام دشمنی بعثت نبوی سے ہے۔ آپؐ کی ہجرت سے قبل مدینہ میں ان کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ مارکیٹ پر ان کا کنٹرول تھا۔ وہ شراب، سونا چاندی اور ہتھیار کی تجارت کرتے تھے۔ وہ مدینہ اور اس کے اطراف کے لوگوں کو سودی قرض دیتے، آپس میں لڑاتے اور ہتھیار فروخت کرتے یعنی وہ کتابِ الٰہی کے احکامات کو خاطر میں نہ لاتے بلکہ دولت کمانا اور اپنی برتری قائم کرنا ان کا مقصد تھا۔

اسی تناظر میں موجودہ عہد میں دنیا پر نگاہ ڈالیں۔ ہر طرف بدامنی، خون خرابہ اور تباہی و بربادی کا بازار گرم ہے۔ معیشت تباہ ہے، کوئی ملک ایسا نہیں ملے گا جو اس طرح کی پریشانیوں سے محفوظ ہو۔ اس کی ذمہ داری اسلام اور مسلمانوں پر ڈالی جاتی ہے۔ یہ ساری انسانیت کی فلاح کے لیے آیا ہے۔ اسلام کا پیغام ساری دنیا کے لیے ہے۔ اللہ رب العالمین یعنی سارے عالم کا رب ہے۔ رسول رحمۃ للعالمین یعنی سارے عالم کے لیے رحمت ہے جبکہ قرآن ھدیً للعالمین یعنی سارے عالم کے لیے ہدایت ہے۔ اگر دنیا کے لوگ ان باتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں تو ان کے دل و دماغ سے یہ سارے مصنوعی شبہات دور ہوں گے۔

دوسری طرف مثلث کے تینوں باز و یہودی، نصاریٰ اور مشرکین میں سے دنیا کے ہر ملک میں برپا ہونے والے فساد کی جڑ میں کوئی نہ کوئی، سب کے سب یا ان میں سے بیشتر کا ہاتھ نظر آئے گا فی الحال دنیا کے سپر پاور اور اس پر یہود کا تسلط، مشرقِ وسطیٰ پر خصوصاً اور ساری دنیا پر عموماً پایا جارہا ہے اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو جو پال فنڈلے کی کتاب سے ماخوذ ہے۔

اب اس کتاب کے اقتباسات پیش خدمت ہیں جسے امریکی سیاست کے رازداں پال فنڈلے نے لکھا ہے۔ یہ انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے۔ کتاب کا نام They dare to speak out ہے جسے سعید رومی نے پہلی بار اردو کے قالب میں ڈھالا ہے اور ''شکنجہ یہود'' کے نام سے بازار میں دستیاب ہے۔ مصنف ایک سینئر ریپبلیکن ممبر تھا اور ایوان کی مشرقِ وسطیٰ سے تعلق رکھنے والے ۱۹ خارجہ تعلقات کمیٹیوں میں سے ایک کا سربراہ تھا۔ AIPAC امریکن اسرائیل پبلک افیئرس کمیٹی اسرائیلی لابی کا ایک حصہ ہے لیکن اثر اندازی کے لحاظ سے یہ اہم ترین حصہ ہے۔ یہ تنظیم پچھلے چند برسوں سے بہت گہرائی اور گیرائی حاصل کرچکی ہے۔ یہ کہنا قطعاً مبالغہ آمیز نہ ہوگا کہ مشرقِ وسطیٰ پالیسی کے بارے میں یہ تنظیم کیپٹل ہل کے ہر اہم پہلو پر چھا چکی ہے۔ ہاؤس اور سینیٹ کے ممبران تقریباً بلا استثنا اس کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں کیونکہ انھیں علم ہے کہ یہ تنظیم کیپٹل ہل پر ایک سیاسی قوت کی براہِ راست نمائندہ ہے جو ان کے الیکشن کے وقت ان کے امکانات کو بنا اور بگاڑ سکتی ہے۔ (۱۳)

AIPAC نام ہی ایک قوت کا ہے یعنی دہشت زدہ کردینے والی قوت کا ہے۔ اس کا جو شائع شدہ مواد ملتا ہے اس میں نیویارک ٹائمز اخبار کا یہ جملہ ہمیشہ بطور حوالہ درج ہوتا ہے کہ یہ تنظیم مضبوط ترین، منظّم ترین اور مؤثر ترین گروپ ہے جو واشنگٹن میں خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہوتی ہے۔

☆☆☆

اسلام کا نظریہ طب و علاج (۱)

ولی اللہ مجید قاسمی ☆

علم انسان کا ایک خصوصی وصف ہے، یہی وہ صفت ہے جس سے انسان دیگر مخلوقات سے ممتاز ہوتا ہے، اس کی یہی وہ خوبی ہے جس کے سامنے فرشتے سجدہ ریز ہوگئے، معلم انسانیت اور آخری پیغمبر ﷺ پر سب سے پہلے نازل ہونے والی وحی میں ''پڑھنے'' کا تذکرہ ہے، جس سے علم کی اہمیت روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے، اس کے علاوہ متعدد موقعوں پر طلب علم کی جس طرح حوصلہ افزائی کی گئی ہے، کسی آسمانی صحیفہ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے اور حدیث میں تو ''طلب علم'' کو ایک اسلامی فریضہ قرار دیا گیا ہے: ''**طلب العلم فريضة**'' (۱)

علم خواہ کوئی بھی ہو اس کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے اور اسلام اپنے پیروکاروں پر اس سلسلہ میں کوئی قدغن اور پابندی عائد نہیں کرتا ہے، تاہم تمام علوم میں ''دینی'' اور ''طبی'' علم کا جو مرتبہ و مقام ہے اس سے ہر شخص واقف اور آشنا ہے، بلکہ کہنے والوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ علم تو صرف دو ہی ہیں؛ دینی اور طبی علم۔ **العلم علمان علم الفقه للأديان وعلم الطب للأبدان** (۲)

قرآن نازل ہوا ''قلبی امراض'' کے شفا کے لیے، تاہم اس میں جسمانی بیماری اور اس کے علاج کا بھی تذکرہ ہے، علامہ ابن قیم نے اس سلسلہ میں بڑی تفصیلی بحث کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ طب کے بنیادی اصول تین ہیں: صحت کی حفاظت، نقصان دہ چیزوں سے احتراز اور فاسد مادہ کا اخراج۔ حفاظت صحت کی غرض سے مسافر کے لیے روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی گئی کہ بھوک کی حالت میں سفر صحت کے لیے نقصان دہ ہے، سر میں کوئی تکلیف ہو تو حالت احرام میں بھی سر منڈوانے کی گنجائش پیدا کی گئی تاکہ اس کی وجہ سے فاسد اور خراب مادہ نکل سکے جو سر میں تکلیف کا باعث ہے، نقصان دہ چیزوں سے احتراز کے پیش نظر مریض کے لیے پانی کی جگہ تیمم کی طرف

☆ استاذ حدیث وفقہ جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

(۱) ابن ماجہ (۲) مفتاح السعادۃ ۱/ ۲۶۷، یہ حضرت امام شافعی کا قول ہے، بعض لوگوں نے اس کی نسبت حضرت علیؓ کی طرف بھی کی ہے۔

رہنمائی کی گئی تاکہ ان نقصانات سے بچا جاسکے جو پانی کی وجہ سے پہنچ سکتے ہیں۔ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو طب کی بنیادی اور اصولی باتوں کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔ (۱)

حدیث نبوی میں اس سلسلہ میں اتنا مواد ہے کہ اس پر بڑی اور ضخیم کتابیں لکھی گئیں ہیں اور تقریباً حدیث کی ہر کتاب میں ''طب'' سے متعلق ایک باب موجود ہے اور آپ ﷺ کے اس ارشاد نے کہ اللہ نے ہر مرض کی دوا پیدا کی ہے (۲) میڈیکل سائنس کی ترقی میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا ہے، یہ حدیث ایک ڈاکٹر کو اس بات پر ابھارتی ہے کہ وہ اس میدان میں ہمیشہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا رہے اور مایوسی و ناامیدی کو اپنے قریب پھٹکنے نہ دے۔ یہ حدیث مریض اور ڈاکٹر دونوں کو ذہنی طور سے تیار کرتی ہے کہ ہر مرض کا علاج ہے، کوئی مرض لاعلاج نہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کے اس ارشاد نے مسلم ڈاکٹر کے لیے نت نئی تحقیقات کی راہیں کھول دی ہے، مسلم ڈاکٹروں نے اس سلسلہ میں جو نمایاں ترقی کی وہ محتاج اظہار نہیں، ابن سینا کی مشہور زمانہ کتاب ''القانون'' کی آج بھی جو اہمیت اور حیثیت ہے اس سے ہر دانا و بینا آگاہ ہے، یورپ کی تحقیقات میں بنیادی کردار ادا کرنے والی یہی کتاب ہے اور انصاف پسند محققین کو اس کا اعتراف بھی ہے۔

علاج توکل کے خلاف نہیں

اسلام نے یہ تصور دیا کہ انسان کا وجود اور اس کی زندگی ''امانت خداوندی'' ہے، اس کی حفاظت میں کسی قسم کی کوتاہی ''خیانت'' ہے، اسلام کا یہ نقطہ نظر ہے کہ ایک قوی مومن اللہ کی نظر میں ایک کمزور مومن کی بہ نسبت بہتر اور پسندیدہ ہے (۳)، یہ حدیث مسلمان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنی صحت کی طرف سے غافل نہ ہو، اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث میں علاج کی تلقین کی گئی ہے، آپؐ نے فرمایا: اللہ کے بندو! علاج کرو یا عباد الله تداووا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر مرض کا علاج پیدا کیا ہے (۴)، ایک مرتبہ آنحضور ﷺ کسی مریض کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور فرمایا: جاؤ فلاں ڈاکٹر کو بلا لاؤ، کسی کہنے والے نے تعجب سے دریافت کیا: اللہ کے رسولؐ: آپؐ ایسا کہہ رہے ہیں؟ ارشاد ہوا: ہاں۔ اس لیے کہ اللہ نے جو بھی بیماری نازل کی ہے اس کے لیے علاج

(۱) زاد المعاد ۴/ ۷-۶ (۲) ما انزل الله من داء الا انزل له شفاء (بخاری و مسلم)

(۳) صحیح مسلم کتاب القدر (۴) جاء ت الاعراب فقالوا يا رسول الله : نتداوى؟ فقال نعم يا عباد الله تداووا فان الله لم يضع داء الا وضع له شفاء غير داء واحد قالوا : ما هو ؟ قال الهرم مسند احمد ۴/ ۲۸۷، ترمذی/ حسن صحیح

بھی نازل فرمایا ہے۔(۱)

حدیث میں اس نقطہ نظر اور خیال کی بھی پرزور تردید کی گئی ہے کہ ''دوا علاج توکل کے خلاف ہے''، حضرت ابوخزامہ راوی ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! دعا، دوا اور احتیاط کے سلسلہ میں آپ ؐ کا کیا خیال ہے؟ کیا یہ اللہ کی تقدیر کو لوٹا سکتی ہیں؟ ارشاد ہوا یہ بھی اللہ کی تقدیر ہی سے ہے(۲)

علامہ ابن قیم اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''صحیح حدیثوں میں دوا، علاج کا حکم ہے اور یہ توکل کے خلاف نہیں، جیسا کہ بھوک، پیاس کو مٹانے اور سردی وگرمی سے بچنے کی تدبیر توکل کے منافی نہیں، بلکہ ''حقیقت توحید'' یہی ہے کہ بندہ ان اسباب کو اختیار کرے جن کے برتنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور ان اسباب کے ترک سے توکل کی حقیقت مجروح ہوگی بلکہ حکمت خداوندی کی توہین بھی ہوگی، اس سے ان لوگوں کی بات بھی کمزور ثابت ہوجاتی ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ''اسباب کو اختیار نہ کرنا توکل کی اعلیٰ قسم ہے'' اس لیے کہ توکل کی حقیقت دینی اور دنیاوی معاملات میں اللہ پر اعتماد ہے اور یہ اعتماد اسباب کو اختیار کر کے ہی ہوگا، ورنہ شریعت اور حکمت دونوں کو معطل کرنا لازم آئے گا، لہٰذا کوئی بندہ اپنی عاجزی کو توکل اور توکل کو عاجزی نہ سمجھ بیٹھے۔

اس میں ان لوگوں کی بھی تردید ہے جو یہ کہہ کر دوا کا انکار کرتے ہیں کہ اگر تقدیر میں شفا ہے تو دوالا حاصل اور اگر شفا نہیں تو علاج بے کار ہے، نیز مرض اللہ کی تقدیر سے ہے اور تقدیر لوٹائی نہیں جاسکتی ہے۔ یہ تو بعینہ وہی سوال ہے جو کچھ دیہاتیوں نے آپ ﷺ سے کیا تھا، رہے افاضل صحابہؓ تو وہ اللہ کی حکمت اور اس کی صفات سے آشنا تھے، وہ اس طرح کا سوال نہیں کرسکتے، آنحضور ﷺ نے ان دیہاتیوں کو جواب بھی ایسا دیا کہ آگے سوال کی گنجائش باقی نہیں رہی، آپ ؐ نے فرمایا کہ دوا، دعا اور احتیاط بھی اللہ کی تقدیر سے ہے، کوئی چیز بھی اس کی تقدیر سے باہر نہیں، بلکہ تقدیر کو تقدیر ہی کے ذریعہ دفع کرنا ہے اور یہ دفع کرنا بھی تقدیر ہے، لہٰذا کسی بھی طرح تقدیر سے فرار کا راستہ نہیں اور یہ علاج ومعالجہ بھوک اور پیاس مٹانے اور سردی وگرمی سے بچاؤ کی تدبیر کی طرح ہے۔(۱)

رہی وہ حدیث جس میں کہا گیا ہے ''میری امت کے ستر ہزار لوگ بے حساب وکتاب جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ نہ تو بدفالی لیتے ہیں اور نہ زخم کو گرم لوہے سے داغتے ہیں اور نہ جھاڑ پھونک کرتے ہیں، بلکہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں (متفق علیہ) تو اس سے مراد علاج ومعالجہ کا وہ طریقہ ہے جس سے فائدہ نہ تو یقینی ہو اور نہ گمان غالب بلکہ وہم پر مبنی ہو، چنانچہ ہندیہ میں ہے کہ مرض کو ختم کرنے کے اسباب تین طرح کے ہیں۔ وہ اسباب جن سے فائدہ یقینی ہو۔ دوسرے وہ اسباب جن سے مرض کے زائل ہونے کا ظن غالب ہو۔ تیسرے وہ اسباب جن سے مرض کا زائل ہونا موہوم ہو جیسے جھاڑ پھونک اور گرم لوہے سے داغنا۔ ابتدا کی دونوں قسموں کو اختیار کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے، البتہ تیسری قسم کو اختیار کرنا توکل کے خلاف ہے۔ (الھندیہ ۵/۳۵۵) یا اس سے مراد علاج کے ممنوع اور ناپسندیدہ طریقے ہیں کہ بسا اوقات جب بیماری طویل ہوجاتی ہے تو انسان علاج کے جائز طریقوں پر اکتفا نہ کر کے، غلط اور ناپسندیدہ طریقوں کا سہارا لیتا ہے اور اللہ پر اس کا اعتماد کمزور ہونے لگتا ہے۔

واقف کار سے علاج

دینی اور دنیاوی تمام کاموں میں ''ماہر تر'' کی طرف رجوع کرنا چاہیے، قرآن وحدیث میں اسی کی ہدایت کی گئی ہے، زندگی اور صحت کی حفاظت مقاصد شریعت میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور ''حفاظت دین'' کے بعد دوسرا درجہ ''حفظ نفس'' ہی کا ہے، اس لیے اس معاملہ میں بہت حساس ہونے کی ضرورت ہے اور دوا وعلاج کے لیے کسی ماہر ڈاکٹر ہی سے رجوع کرنا چاہیے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ کسی صحابی کو زخم آ گیا اور خون پوری طرح سے نہیں بہا اور بند ہوگیا، انھوں نے ڈاکٹروں کو بلایا، دو ڈاکٹر حاضر ہوئے، اللہ کے رسول ﷺ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا تم میں زیادہ ماہر کون ہے ایکما اطب؟(۲)

(۱) عن ھلال بن یساف قال دخل رسول اللہ ﷺ علی مریض یعودہ فقال ارسلوا الی طبیب، فقال قائل وانت تقول ذالک یارسول اللہ؟ قال نعم: ان اللہ عزل وجل لم ینزل داء الا انزلہ لہ دواء زادالمعاد ۴/۱۳۳ (۲) قال قلت یا رسول اللہ: ارأیت رقی نسترقیھا ودواء نتداوی بہ، وتقاہ نتقیھا ھل ترد من قدر اللہ شیئا؟ فقال ھی من قدر اللہ، اخرجہ احمد ۳/۴۲۱

(۱) زادالمعاد ۴/۱۶-۱۵ (۲) عن زید بن اسلم ان رجلا فی زمان رسول اللہ ﷺ أصابہ جرح فاتقن الجرح الدم وان الرجل دعا رجلین من بنی انمار (بقیہ اگلے صفحہ پر)

غیر ماہر ڈاکٹر کی حدیث میں حوصلہ شکنی کی گئی ہے اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایسا شخص علاج کرتا ہے اور اس کی وجہ سے کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے تو وہ شخص ذمہ دار ہوگا۔(۱)

ایک ماہر فن ڈاکٹر کسے کہا جائے گا؟ اس کی کیا کیا خوبیاں ہیں؟ اس سلسلہ میں علامہ ابن قیم کا بیان ہے کہ واقف کار ڈاکٹر کو ان اوصاف کا حامل ہونا چاہیے:

۱-مرض کی نوعیت کے جانچنے کی صلاحیت کہ بیماری کس قسم کی ہے اور مرض کا سبب کیا ہے؟ اس بیماری کے پیدا ہونے کی وجہ کیا ہے؟

۲-مریض کے بدن میں مرض سے مقابلہ کی صلاحیت اور قوت کا علم اور جسم کا طبعی مزاج اور مرض کی وجہ سے پیدا ہونے والے غیر طبعی مزاج سے واقفیت۔

۳-دوا کی قوت اور بیمار کے جسمانی قوت سے موازنہ اور دوا کے ری ایکشن اور اس کے توڑ کی صلاحیت۔

۴-مریض کی عمر، عادت اور مرض کے وقت کے موسم کی رعایت، نیز اس بات کا علم کہ مریض جہاں کا رہنے والا ہے وہاں کی آب وہوا کیسی ہے؟

۵-ایسے طور سے مرض زائل کرنے کی کوشش کرے کہ اس دوا کی وجہ سے کسی دوسرے شدید مرض میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو۔

۶-مریض کے دل کی کیفیت اور اس کی بیماریوں سے مکمل طور پر واقفیت کہ جسم کے علاج میں دل بنیادی کردار ادا کرتا ہے اور جسم کی خرابی سے دل متاثر ہوا کرتا ہے۔

۷-مریض کی خیر خواہی اور اس کے ساتھ شفقت ونرمی اور دلداری کا برتاؤ کرنا۔

۸-طبعی، الٰہی (روحانی) نفسیاتی علاج میں سے ہر ایک کو ملحوظ رکھے، اس لیے کہ ماہر ڈاکٹر نفسیاتی علاج کے ذریعہ سے وہاں تک پہنچ سکتا ہے جہاں دوا کی پہنچ نہیں۔

۹-سہل سے سہل تر علاج کی کوشش کرے، دوا اسی وقت دے جبکہ غذا سے علاج ممکن نہ رہے، ایسے ہی اگر مفرد دوا سے کام چل جائے تو مرکب دوا نہ دے۔

اگر کوئی شخص ان ذمہ داریوں کے نباہنے کا اہل نہیں ہے تو وہ ڈاکٹر شمار کیے جانے کے لائق

(بقیہ) فنظرا الیه فزعما ان رسول الله ﷺ قال لهما ایکما اطب فقال اوفی الطب خیر یا رسول الله فقال: انزل الدواء الذی انزل الداء الموطا ۴/ ۳۲۸ بشرح الزرقانی وهو مرسل

(۱) من تطبب ولم یعلم منه الطب قبل ذالك فهو ضامن، ابوداؤد

نہیں۔(۱)

واقعہ ہے کہ ابن قیم نے ایک ڈاکٹر کی جن خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے میڈیکل سائنس کی ترقی نے اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا ہے، آج بھی میڈیکل سائنس میں بنیادی طور پر تین باتیں زیر بحث آتی ہیں:

(الف) مرض کی علامت اور سبب کی تشخیص

(ب) دوا اور اس کے مثبت ومنفی اثرات

(ج) مریض کے جسم میں دوا کے قبول کرنے کی صلاحیت

یہ وہ باتیں ہیں جن کا تذکرہ خود علامہ ابن قیم نے کیا ہے اور ان کے سوا پیش کردہ شرائط کی بھی میڈیکل سائنس میں رعایت کی جاتی ہے۔

ناواقف ڈاکٹر

جس ڈاکٹر کے اندر مذکورہ صلاحیت نہ ہو اسے فقہی اصطلاح میں ''طبیب جاہل'' کہا جاتا ہے اور عوام کو تکلیف، مشقت، پریشانی، فریب اور دھوکہ دہی سے بچانے کے لیے اسلامی قانون ایسے افراد پر پابندی لگاتا ہے، چنانچہ درمختار میں ہے کہ تین قسم کے افراد پر پابندی عائد کی جائے گی؛ آوارہ فکر مفتی، طبیب جاہل اور مفلس شخص جس کے پاس کچھ نہیں۔

علامہ ابن عابدین اس کی تشریح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ یہ تینوں شخص دین، بدن اور مال کو فاسد اور خراب کرنے والے ہیں، اس لیے ان پر پابندی لگائی گئی، کیونکہ عمومی نقصان کے مقابلہ میں انفرادی نقصان کو گوارا کرلیا جاتا ہے، گویا یہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے قبیل سے ہے(۲)۔

وہ ڈاکٹر جو ان خصوصیات کا حامل ہے مگر اس کے پاس کسی میڈیکل کالج کی سرٹیفکیٹ نہیں ہے تو اس کا شمار ''طبیب جاہل'' میں نہیں ہوگا، اس لیے کہ اصل مقصود مہارت وحذاقت ہے نہ کہ سرٹیفکیٹ کا حصول، تاہم چونکہ سرٹیفکیٹ اور طبی تصدیق نامہ آج کے دور میں حذاقت ومہارت کی پہچان بن چکا ہے اور اس کے بغیر کسی کی مہارت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے، اس لیے اس کا حصول بھی ضروری ہے۔

(۱) علامہ ابن قیم نے بیس شرطوں کا تذکرہ کیا ہے، اختصار کے پیش نظر ان میں سے چند کو چھوڑ دیا گیا ہے اور ترتیب میں بھی کچھ تبدیلی کی گئی ہے۔ (زادالمعاد ۴/ ۱۴۳-۱۴۴) (۲) درمختار مع الرد ۶/ ۱۴۶

ناواقفیت کے باوجود علاج

ناواقف اور نااہل ڈاکٹر نے کسی کا علاج کیا اور مریض اس کی جہالت سے ناآشنا ہے تو اس علاج کے نتیجے میں پہنچنے والے نقصان کا یہ شخص ذمہ دار ہوگا، چنانچہ حدیث نبوی ہے: جس ڈاکٹر نے کسی قوم کا علاج کیا حالانکہ وہ پہلے سے اس فن میں مشہور نہیں تھا اور اس کے نتیجہ میں کوئی نقصان ہوجائے تو وہ ضامن ہوگا۔(۱)

علامہ ابن قیم اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں: اگر مریض نے اسے ڈاکٹر سمجھ کر علاج کی اجازت دی ہے تو اس علاج سے پہنچنے والے نقصان کا ذمہ دار ڈاکٹر ہوگا، یہی حکم اس وقت بھی ہے جب اس کے لیے کوئی دوا تجویز کرے کہ وہ اسے استعمال کرے اور مریض نے اس خیال سے کہ یہ شخص واقف ہونے اور اس فن میں مہارت کی وجہ سے رہنمائی کررہا ہے یہاں تک کہ وہ اس دوا کی وجہ سے ہلاک ہوجائے تو طبیب اس کا ضامن ہوگا، حدیث اس سلسلہ میں ظاہر اور بالکل صریح ہے۔(۲)

لیکن چونکہ اس میں ایک گونہ مریض کی رضا اور اجازت بھی شامل ہے اس لیے ہلاکت کی وجہ سے اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا بلکہ خوں بہا واجب ہے اور اس رقم کی ادائیگی میں اس کے خاندان والے یا شریک کار لوگ (عاقلہ) بھی شامل ہوں گے، علامہ خطابی کا بیان ہے:

''جب ڈاکٹر زیادتی کر بیٹھے اور اس کی وجہ سے مریض ہلاک ہوجائے تو وہ ضامن ہوگا، میں نہیں جانتا کہ اس مسئلہ میں کوئی اختلاف ہے اور جو شخص ایسے علم یا عمل کو اختیار کیے ہوئے ہے جس سے وہ واقف نہیں تو ایسا شخص زیادتی کرنے والا ہے، لہٰذا اگر اس کے فعل سے کوئی ہلاک ہوجائے یا کوئی عضو تلف ہوجائے تو وہ خوں بہا کا ضامن ہوگا اور اس سے قصاص ساقط ہے، کیونکہ یہ علاج مریض کی اجازت سے خالی نہیں اور نااہل ڈاکٹر کے جرم کا تاوان اکثر فقہاء کے نزدیک اس کے متعلقین (عاقلہ) پر ہے۔''(۳)

(۱) ایما طبیب تطبب علی قوم لا یعرف له قبل ذلك فاعنت فهو ضامن (ابوداؤد ۲/۶۳۰) (۲) زادالمعاد ۴/۱۴۰ (۳) حوالہ سابق ۴/۱۳۹ حنفیہ کا بھی یہی مذہب ہے کیونکہ ان کے یہاں جو شخص قتل کا بالواسطہ ذریعہ بنا ہو (متسبب) تو خوں بہا اس کے متعلقین پر واجب ہوتا ہے۔(ہدایہ مع فتح القدیر ۱۰/۲۹۹)

ناواقف ڈاکٹر پر صرف تاوان کا واجب ہونا مریض کے حق کی وجہ سے ہے، لیکن اگر قاضی مناسب سمجھے تو اس کی تنبیہ اور سرزنش وفہمائش بھی کرسکتا ہے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور کوئی اس طرح کے علاج پر اقدام نہ کرے۔ علامہ ابن رشد فرماتے ہیں؛

''اور اگر وہ اس کا اہل نہ ہو تو اس کی پٹائی کی جائے اور قید میں ڈال دیا جائے اور اس پر تاوان واجب ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تاوان صرف اسی کے مال سے لیا جائے گا اور کہا گیا ہے کہ اس کے متعلقین بھی اس میں شریک ہوں گے۔''(۱)

اگر مریض ڈاکٹر کی جہالت سے واقف ہے اور اس کے باوجود علاج کی اجازت دے دیتا ہے تو ڈاکٹر نقصان کا ذمہ دار نہ ہوگا۔(۲)

علاج کی وجہ سے نقصان

اپنے فن میں مہارت اور قانونی طور سے علاج کی اجازت کے ساتھ ایک ڈاکٹر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ علاج میں ہر ممکن تدبیر کو ملحوظ رکھے، مریض کی مکمل دیکھ ریکھ، جانچ اور اس میں ڈاکٹری آلات سے مدد لینا اس کی ذمہ داریوں میں شامل ہے، ڈاکٹری اصول کا لحاظ کرتے ہوئے اور کسی کوتاہی ولاپرواہی کے بغیر اس علاج سے کوئی نقصان پہنچ جائے تو وہ ماخوذ نہیں ہوگا، اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے، علامہ ابن قیم لکھتے ہیں:

''ماہر ڈاکٹر جس نے علاج میں فن کا حق ادا کردیا اور اس نے کوئی لاپرواہی نہیں کی تو اس کے اس فعل کی وجہ سے جس میں شریعت اور مریض کی اجازت شامل ہے کوئی عضو تلف ہوجائے یا جان چلی گئی یا کوئی صلاحیت زائل ہوگئی تو اس پر ضمان بہ اتفاق واجب نہیں ہے۔''(۳)

لیکن اگر اس نے اس سلسلہ میں کسی کوتاہی اور بے احتیاطی سے کام لیا ہے تو وہ اپنے فعل کا ذمہ دار ہوگا اور اس پر تاوان واجب ہے، علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ نے اس سے متعلق بڑی عمدہ بحث کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اجازت کے بعد تاوان واجب نہ ہونے کے لیے دو شرطیں ہیں، وہ اپنے فن میں ماہر، واقف کار اور صاحب بصیرت ہو۔ دوسرے کوئی بے احتیاطی نہ کرے۔ اگر وہ اپنے فن میں

(۱) بدایة المجتهد ۲/۲۳۳ (۲) وان علم المجنی علیه انه جاهل واذن له فی طبه لم یضمن زاد المعاد ۱/۱۴۰ (۳) حواله سابق ۱/۱۳۹

مہارت کے باوجود کوتاہی کر جائے مثلاً ختنہ کرنے میں ''حشفہ'' یا اس کے بعض حصہ کو کاٹ دے یا ایسے آلات سے آپریشن کیا کہ اس کی وجہ سے تکلیف بڑھ گئی یا ایسے وقت میں آپریشن کیا کہ اس وقت آپریشن مناسب نہ تھا ان تمام صورتوں میں وہ ضامن ہوگا، امام شافعی اور اصحاب رائے کا بھی یہی مذہب ہے اور میں نہیں جانتا کہ اس مسئلہ میں کوئی اختلاف ہے۔(۱)

بے اجازت علاج

ذمہ داری اور تاوان سے بری ہونے کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ ڈاکٹر مریض کی اجازت سے علاج کرے، اگر وہ اجازت دینے کی پوزیشن میں نہ ہو مثلاً پاگل، بے ہوش یا نابالغ ہے تو اس کے سرپرستوں سے اجازت لینا واجب ہے، اس اجازت میں کسی بھی طرح کا ذہنی اور نفسیاتی دباؤ نہ ہو، اگر اس نے ایسا نہیں کیا اور بے اجازت علاج کرنے لگا اور اس علاج سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوا تو ڈاکٹر ذمہ دار ہوگا، گو وہ علاج اس کی نظر میں ضروری ہی کیوں نہ ہو۔ مشہور محقق اور بالغ نظر فقیہہ علامہ ابن نجیم مصری حنفی لکھتے ہیں:

''دونوں روایتوں کے مجموعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تاوان واجب نہ ہونے کے لیے دو شرطیں ہیں، حد سے آگے نہ بڑھنا اور اجازت کا ہونا، اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں شرطیں نہیں پائی گئیں تو تاوان واجب ہے۔''(۲)

اس سلسلے میں بھی تقریباً تمام فقہاء کا اتفاق ہے(۳)، امام احمد کے متبعین کا بھی یہی خیال ہے(۴)، لیکن علامہ ابن قیم حنبلی کو اس سے اختلاف ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ ڈاکٹر کا احسان ہے اور احسان کرنے والے پر کوئی الزام نہیں، لہٰذا اس کی طرف سے علاج میں کوئی لاپرواہی نہ ہوئی ہو تو اسے ضامن قرار دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔(۵)

تاوان کے واجب ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف اس صورت میں ہے جب کہ مریض اجازت دینے کی پوزیشن میں ہو یا اس کے سرپرست موجود ہوں، اگر وہ اجازت دینے کا اہل نہیں مثلاً بے ہوش ہو اور جائے حادثہ پر اس کے متعلقین اور رشتہ دار موجود نہ ہوں اور نہ ہی ان سے ربط

(۱)المغنی ۵/۳۱۳کتاب الاجارۃ (۲)البحرالرائق ۸/۲۹ (۳) دیکھئے کتاب الام للامام الشافعی ۶/۱۷۶ (۴) دیکھئے المغنی ۵/۳۱۳، عبارت یہ ھے وان ختن صبیا بغیر اذن ولیہ فسرت جنایتہ ضمن لانہ قطع غیر ماذون (۵)زاد المعاد ۴/۱۴۱

قائم کیا جا سکتا ہو تو اس صورت میں اگر آپریشن یا علاج ضروری ہو کہ اس کے بغیر مریض کی زندگی یا جسم کے کسی حصہ کو خطرہ لاحق ہے، علاج کے بغیر کوئی چارہ نہیں تو اس وقت بے اجازت علاج درست ہے اور ناکامی کی صورت میں وہ ذمہ دار نہ ہوگا، کیونکہ ہر انسان کا فریضہ ہے کہ وہ دوسرے کو نقصان اور ہلاکت سے بچانے کی بھرپور کوشش کرے، یہ اس کی ذمہ داری ہے اور اس کے واجبات میں شامل ہے، ایک انسانی جان کی کس قدر وقعت ہے اور اس سلسلہ میں وہ کس درجہ ماخوذ ہوگا؟ اس کا اندازہ اس مسئلہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ ابن قدامہ حنبلی نے لکھا ہے

''اگر کوئی اس حالت میں پہنچ گیا کہ دوسرے کا کھانا اور پانی لیے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا ہے اور دوسرے سے اس نے مانگا لیکن دوسرے شخص نے اس کھانے سے اس وقت بے نیاز ہونے کے باوجود انکار کر دیا اور اس کی وجہ سے یہ شخص مر گیا تو دوسرا جس سے کھانا مانگا تھا ضامن ہوگا، نیز وہ فرماتے ہیں کہ کسی کو ہلاک ہوتے ہوئے دیکھ کر قدرت کے باوجود بچانے کی کوشش نہیں کی تو وہ گنہ گار ہوگا بلکہ بعض فقہاء کے یہاں ایک فرض سے غفلت کی بنا پر تاوان بھی واجب ہے۔''(۱)

گویا ڈاکٹر اس حالت میں شریعت کی طرف سے اجازت یافتہ ہوتا ہے نیز دلالۃً سرپرستوں کی طرف سے بھی اجازت ہوتی ہے کہ اگر وہ موقع پر موجود ہوتے تو ضرور اجازت دے دیتے۔

مریض کا عیب ظاہر کرنا

غیبت حرام اور گناہ کبیرہ ہے، قرآن میں بہ صراحت اس سے منع کیا گیا ہے اور اپنے مردہ بھائی کے گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا ہے، کسی کے راز کو ظاہر کرنا بھی ایک طرح سے غیبت ہی ہے، کیونکہ غیبت کی تعریف ہے کہ کسی کا تذکرہ اس انداز سے کرنا جسے وہ ناپسند کرتا ہے ان تذکر اخاک بما یکرہ (الحدیث)

ایک ڈاکٹر کی ذمہ داری اس سلسلہ میں اور بڑھ جاتی ہے، کیونکہ لوگ اس سلسلہ میں اس پر اعتماد کرتے ہیں نیز وہ اپنے مریض کا راز دار ہوتا ہے، اس کے راز کو ظاہر کرنا امانت داری کے خلاف ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مجلس کی باتیں امانت ہوتی ہیں، نیز آپ نے فرمایا کہ **اذا حدث الرجل بالحدیث ثم التفت فھی امانۃ** جب کوئی کسی سے کوئی بات کرے پھر ادھر ادھر دیکھنے

(۱)المغنی ۸/۲۳۸

لگے کہ کوئی سن تو نہیں رہا ہے تو وہ امانت ہے۔(مشکوٰۃ/۴۳۸)

علامہ ابن الحاج مالکی لکھتے ہیں:

''طبیب کو مریض کے اسرار کا امین ہونا چاہیے، مریض نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کو کسی پر ظاہر نہ کرے کیونکہ مریض نے اس کی اجازت نہیں دی ہے، اگر اجازت دے دے تو بھی طبیب کو چاہیے کہ وہ کسی سے اس کے عیوب اور امراض کو ظاہر نہ کرے۔''(المدخل ۴/۱۳۵)

اور حلف نامہ ''بقراط'' میں ہے:

''علاج کے دوران یا اس کے باہر میں مریض کی زندگی میں ایسی کوئی چیز دیکھوں گا جسے کسی صورت ظاہر نہیں کرنا چاہیے تو میں اس کا تذکرہ شرمناک تصور کروں گا۔''(۱)

نیز کویت میں طب اسلامی پر بین قومی کانفرنس کے موقع پر ایک مسلم ڈاکٹر کے لیے جو حلف نامہ تجویز کیا گیا اس میں ایک دفعہ یہ بھی ہے:

''میں لوگوں کے وقار کو ملحوظ رکھوں گا، ان کی نجی باتوں پر پردہ ڈالوں گا اور ان کے رازوں کی حفاظت کروں گا......اے اللہ تو اس حلف کے تئیں گواہ رہنا۔''(۲)

لیکن کبھی اس سے اہم تر مقصد کے لیے راز کو ظاہر کر دینا ہی واجب اور ضروری ہو جاتا ہے، ہمیں اس سلسلہ میں احادیث میں متعدد واقعات ملتے ہیں۔

(الف) ایک صحابی آپؐ کے پاس آئے اور کہا میں ایک انصاری عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہوں، رسول مقبول ﷺ نے فرمایا: ایک نظر اس لڑکی کو دیکھ لو کیونکہ انصار کی آنکھوں میں کچھ عیب ہے۔(۳)

(ب) فاطمہ بنت قیس فرماتی ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا کہ معاویہ اور ابوجہم نے مجھے نکاح کا پیغام دیا ہے، آپ کی کیا رائے ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ابوجہم تو ذرا کچھ سخت قسم کے آدمی ہیں اور معاویہ محتاج ہیں۔(۴)

(ج) آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ مجالس کی باتیں امانت ہیں، سوائے تین مجلسوں کے یعنی قتل

(۱)و(۲) دیکھئے جدید حیاتی مسائل اور اسلام تالیف ابوالفضل محسن ابراہیم (۳) مشکوٰۃ ۲/۲۶۸

(۴) حوالہ سابق ۲/۲۸۸

ناحق، زنا کاری اور لوٹ مار سے متعلق مجلسیں۔

مذکورہ بالا واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ عظیم تر مقصد کے پیش نظر غیبت کو انگیز کیا جا سکتا ہے، فقہاء و محدثین نے ان احادیث کو سامنے رکھ کر اصول بنایا کہ کسی صحیح مقصد کے حصول کے لیے غیبت اور راز کو ظاہر کرنا جائز اور درست ہے۔ جیسے:

☆ ظالم کے ظلم کا تذکرہ تاکہ انصاف مل سکے۔

☆ منکرات اور برائیوں کو روکنے کی غرض سے۔

☆ مشورہ کے وقت اصل حقیقت کو ظاہر کرنا۔

☆ کسی مسلمان کو دھوکہ دہی سے بچانے کے لیے۔

☆ فتویٰ دریافت کرنے کے مقصد سے۔

☆ ذمہ داروں اور سرپرستوں کو ان کے ماتحتوں کے حالات سے باخبر کرنا تاکہ ان کی تنبیہ کر سکیں۔(۱)

جدید میڈیکل قانون میں بھی اس اصول کی رعایت ہے، چنانچہ بیوچیمپ اور چائلڈریس کہتے ہیں کہ ڈاکٹر راز داری کو صرف اسی حالت میں توڑ سکتا ہے جبکہ اس کا توڑنا اس کے برخلاف اہم ترین ذمہ داری کی انجام دہی کے لیے ضروری ہو۔(۲)

شادی کا مسئلہ

مذکورہ تفصیلات سے معلوم ہوا کہ کسی بڑے مقصد کے حصول کے لیے راز ظاہر کرنے کی اجازت ہے، اس لیے کسی عورت یا مرد میں ایسا کوئی عیب ہے کہ دوسرا فریق باخبر ہونے کی صورت میں اس عقد پر راضی نہیں ہو سکتا ہے تو ڈاکٹر یا ہر اس شخص کے لیے جو اس عیب سے واقف ہے جائز ہے کہ وہ صاحب معاملہ کو اس سے آگاہ کر دے، گو صاحب معاملہ نے اس سے اس سلسلہ میں مشورہ طلب نہ کیا ہو۔ چنانچہ علامہ ابن عابدین کا بیان ہے:

''کسی نے خریدار کو دیکھا کہ وہ بیچنے والے کو کھوٹے سکے ادا کر رہا ہے تو وہ بیچنے والے سے کہہ دے کہ اس سے بچو۔''(۳)

اگر صاحب معاملہ نے اس سے مشورہ کیا ہے تو اس وقت اصل حقیقت سے آگاہ کرنا

(۱) د: احیاء علوم الدین مع الاتحاف ۹/۳۳۲، فتح الباری ۱۰/۵۷۸، رد المحتار ۶/۴۰۹ (۲) جدید حیاتی مسائل/۳۳ (۳) رد المحتار ۶/۴۰۹

صرف جائز ہی نہیں بلکہ واجب اور ضروری ہے اور بصورت دیگر وہ گنہ گار ہوگا، کیونکہ صحیح مشورہ دینا واجب ہے، امام نووی شافعی لکھتے ہیں:

''اور مشورہ دینے والے پر واجب ہے کہ اس کی حالت کو چھپائے نہیں، بلکہ جس کے متعلق مشورہ کر رہا ہو، اس کی برائیوں کو خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ واضح کردے۔''(۱)

یہی حکم جاسوس اور جرائم پیشہ افراد کا بھی ہے کہ اگر کوئی ان سے واقف ہو تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ حکومت کے متعلقہ محکمہ کو اطلاع کردے تاکہ اس کے ضرر سے محفوظ رہا جاسکے، نیز متعدی امراض (جیسے ایڈز) کے حامل لوگوں کی بھی رازداری نہیں کرنی چاہیے بلکہ تمام لوگوں کو اس سے آگاہ کردینا چاہیے تاکہ یہ مرض دوسروں کو لاحق نہ ہو۔

ڈرائیور کی بینائی متاثر ہو یا وہ شرابی ہو

اصول یہ ہے کہ اجتماعی ضرر اور نقصان کے مقابلہ میں انفرادی ضرر کو گوارا کرلیا جاتا ہے، یتحمل الضرر الخاص لدفع ضرر العام"(۲)، اس اصول کی روشنی میں ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ اگر ڈرائیور کی بینائی کمزور ہے یا وہ نشہ کا عادی ہے تو ڈاکٹر کی ذمہ داری اور فریضہ ہے کہ متعلقہ محکمہ کو اس کی اطلاع کردے گرچہ اس کی وجہ سے ڈرائیور کی ملازمت خطرہ میں پڑجائے اور وہ معاشی پریشانیوں سے دوچار ہوجائے، کیونکہ اس کی خاموشی اور رازداری اس سے بڑے خطرہ کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔

مجرم کی بابت اطلاع

شہادت (گواہی) ایک امانت ہے، جس طرح امانت کی واپسی ضروری اور اس میں خیانت بدترین گناہ ہے، اسی طرح سے گواہی دینا لازم اور اس کو چھپانا معصیت ہے، رب کائنات کا ارشاد ہے:

ولاتكتموا الشهادة ومن يكتمها فانه آثم قلبه(۳)

اور گواہی مت چھپاؤ، جو کوئی گواہی چھپاتا ہے تو اس کا دل گنہ گار ہے۔

نیز فرمان باری ہے:

واقيموا الشهادة لله (۴)

(۱) ریاض الصالحین/۵۸۱ (۲) الاشباہ والنظائر لابن نجیم/۸۷ (۳) سورہ بقرہ ۲۸۳ (۴) سورہ طلاق ۲

اللہ کے لیے گواہی قائم کرو۔

غرض یہ کہ گواہی ایک مذہبی اور دینی فریضہ ہے، اس سے پہلو تہی سخت ناپسندیدہ ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر کسی مریض کے جرم سے آگاہ ہے اور اسی جرم کی بنا پر دوسرا بے قصور شخص ماخوذ ہے، مقدمہ زیر سماعت ہے اور پورا اندیشہ ہے کہ دوسرا شخص مجرم قرار دے دیا جائے اور اصل مجرم بری ہوجائے تو ایسی صورت میں ڈاکٹر (یا کوئی بھی جو اس جرم سے واقف ہے) کی ذمہ داری ہے کہ وہ اصل مجرم کے متعلق عدالت میں گواہی دے تاکہ بے گناہ رہا ہوسکے۔

ناجائز بچے کے متعلق اطلاع

''فحشاء'' مثلاً زنا و چوری وغیرہ کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ممکن حد تک اس کی اشاعت نہ ہو اگر کوئی مومن شامت اعمال سے اس میں مبتلا ہوجائے تو جاننے والے کے لیے بہتر ہے کہ اسے چھپالے، اپنے تک محدود رکھے، عدالت تک اسے نہ لے جائے، حضرت ماعز اسلمی کے واقعہ میں اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ہزال سے -جنھوں نے حضرت ماعز کو ترغیب دی تھی کہ آپؐ کے پاس جاکر اعتراف گناہ کرلیں- فرمایا:''لوسترته بثوبك لكان خيرا لك''(۱) نیز آپؐ نے ارشاد فرمایا:''من ستره سترهالله فى الدنيا والآخرة ''(بخاری ومسلم) جس نے کسی مسلمان کی ستر پوشی کی اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کی ستر پوشی کریں گے۔

اس طرح کی روایتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان معاملات میں شریعت کا نقطہ نظر اخفاء، پوشیدگی اور رازداری کا ہے تاکہ مبتلا شخص معاشرہ میں بدنام نہ ہو، اس کی حیثیت عرفی برقرار رہے، اسی طرح ممکن ہے کہ اللہ اسے توبہ کی توفیق دے دے اور دوبارہ ایسی جرأت نہ کرسکے، اس لیے اگر کوئی عورت اپنے ناجائز بچے کو کسی شاہراہ وغیرہ پر زندہ چھوڑ دے تاکہ سماج میں بدنامی سے بچ سکے اور کوئی شخص اس سے واقف ہے تو اس کے لیے بہتر ہے کہ اخفاء سے کام لے، تاہم اگر مصلحت اس میں ہو کہ متعلقہ محکمہ کو اس سے باخبر کردیا جائے تاکہ اس طرح کے حادثات کی روک تھام ہوسکے تو وہ ایسا کرسکتا ہے۔

حرام اور ناپاک سے علاج

اسلام میں حرام اور ناپاک چیزوں سے علاج کی ممانعت ہے، چنانچہ پیغمبر اسلام کا فرمان ہے: حرام سے علاج مت کرو لا تداووا بالحرام (رواہ ابوداؤد نیل الاوطار ۸/۲۰۴) لیکن یہ حکم

(۱) ابوداؤد مشکوۃ ۲/۳۱۱

عمومی حالت میں ہے، بوقت ضرورت حرام اور ناپاک سے علاج کی اجازت ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے قبیلہ عرینہ کے لوگوں کو علاج کے لیے اونٹ کا پیشاب پینے کے لیے کہا (بخاری ومسلم زادالمعاد ۸/۲۰۴)

اس کے لیے شرعی اضطرار کی بھی شرط نہیں یعنی یہ اجازت صرف اس وقت نہیں جب کہ کوئی جاں بہ لب ہوجائے، حرام دوا کے بغیر زندگی کی امید باقی نہ رہے بلکہ تکلیف شدید کے وقت بھی حرام کے استعمال کی گنجائش ہے، چنانچہ روایتوں میں آتا ہے کہ صحابی رسول حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت زبیر بن العوام خارش میں مبتلا ہوگئے تو اللہ کے رسول ﷺ نے انھیں ریشمی کپڑا پہننے کی اجازت مرحمت فرمائی (۱) حالانکہ ریشم مردوں کے لیے ممنوع ہے۔ (۲)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ عرفجہ نامی ایک صحابی کی ناک کسی جنگ کے موقع پر کٹ گئی تو انھوں نے اس کی جگہ چاندی کی ناک لگالی مگر اس میں بدبو پیدا ہوجاتی تھی تو اللہ کے رسول ﷺ نے انھیں سونے کی ناک لگانے کا حکم دیا۔ (۳)

اس سلسلہ کی روایتوں پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جو چیزیں بذات خود حرام ہیں (حرام بعینہٖ) وہ ضرورت شدیدہ ہی کے وقت جائز ہوں گی اور جو چیزیں کسی عارضی اور سد ذریعہ کے طور پر حرام ہیں وہ معمولی ضرورت اور مصلحت کے وقت بھی جائز ہوجاتی ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے محض ظاہری عیب کو دور کرنے کے لیے حضرت عرفجہ کو سونے کی ناک لگانے کی اجازت مرحمت فرمائی، اس سلسلہ میں اصول بیان کرتے ہوئے علامہ ابن قیم لکھتے ہیں: "**وتحريم الحرير انما كان سدا للذريعة......وهذه قاعدة ما حرم لسد الذرائع فانه يباح عند الحاجة والمصلحة الراجحة**" (۴)

رہی وہ روایت جس میں کہ ہے اللہ نے حرام کردہ چیز میں شفا نہیں رکھی ہے (۵) نیز یہ کہ

(۱) رخص رسول الله ﷺ لعبد الرحمن بن عوف والزبير بن عوام فى لبس الحرير لحكمة كانت بهما بخارى ومسلم (زادالمعاد ۴/۷۶) (۲) ابوداؤد (۳) ابوداؤد و الترمذى و حسنه (۴) زادالمعاد ۴/۷۸ (۵) عن ام سلمة قالت اشتكت لى بنت فنبذت لها فى الكوز فدخل النبى ﷺ وهو يغلى فقال ماهذا فاخبرته فقال ان الله لم يجعل شفاءكم فيما حرم عليكم اخرجه ابويعلى وصححه ابن حبان فتح البارى ۱۰/۹۸ ورواه البخارى تعليقاً وموقوفا عن ابن مسعود فى السكر ان الله لم يجعل شفاءكم فيما حرم

شراب کو بطور دوا استعمال کرنے کے سلسلہ میں آپؐ نے فرمایا کہ "وہ مرض ہے دوا نہیں (۱) اس سلسلہ میں ابن حزم اندلسی کا خیال ہے کہ کوئی چیز جب تک حرام باقی رہے، اس وقت تک اس میں کوئی شفا نہیں ہے، لیکن بہ ضرورت جب حلال ہوجائے تو پھر اس میں شفا پیدا ہوجاتی ہے۔ (۲)

امام طحاوی حنفی کا رجحان ہے کہ حرام چیزوں کو بطور دواء استعمال کرنے کی ممانعت صرف شراب کے ساتھ خاص ہے اور اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ عرب شراب میں بذات خود شفا کا عقیدہ رکھتے تھے، نیز اس میں تعظیم اور تقدیس کا پہلو بھی تھا، لہٰذا شراب کے علاوہ دیگر حرام اشیاء سے بہ ضرورت دوا کی اجازت ہے۔

ممتاز محدث اور شارح بخاری علامہ ابن حجر عسقلانی کی بھی یہی رائے ہے (۳)، علامہ کشمیری فرماتے ہیں کہ حدیث اپنے عموم پر محمول ہے نشہ آور اشیاء کے ساتھ خاص نہیں ہے، البتہ یہ حکم عام اور اختیاری حالت میں ہے۔ لہٰذا اضطراری حالت میں جبکہ اس کا کوئی بدل موجود نہ ہو، تمام حرام چیزوں سے علاج کی اجازت ہے علامہ کشمیری ایک بڑا اچھوتا نکتہ بیان کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ حدیث میں شفا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یہ لفظ بابرکت چیزوں کے لیے استعمال ہوا ہے اور بے برکت اور ناجائز چیزوں میں گر کوئی فائدہ ہو تو اس کے لیے منفعت کا لفظ بولا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن میں شراب اور جوئے کے متعلق کہا گیا ہے وفيها اثم كبير و منافع للناس، لہٰذا حرام چیزوں میں بھی منفعت ہوسکتی ہے، لیکن شریعت کی زبان میں اس کے لیے شفا کا لفظ استعمال نہیں کیا جائے گا۔ (۴)

فقہاء مذاہب کا بھی تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ بہ ضرورت حرام کو بطور دواء استعمال کرنے کی اجازت ہے، چنانچہ فقہ حنفی میں صراحت ہے کہ اگر حرام کے شفا ہونے کا غالب گمان ہو اور اس کا کوئی بدل موجود نہ ہو تو پھر استعمال کی اجازت ہے۔ وقيل يرخص اذا علم فيه الشفاء ولم يعلم دواء آخر......وعليه الفتوى (۵) اور ابن العربی مالکی کا بیان ہے کہ بہ ضرورت شراب سے انتفاع جائز ہے کیونکہ دوا کا استعمال نہ کرنا کبھی موت کا سبب بن سکتا ہے، حالانکہ حالت

(۱) سئل عن الخمر يجعل فى الدواء فقال انها داء وليس بدواء رواه ابوداؤد والترمذى زاد المعاد ۴/۱۵۵ (۳) دیکھئے معارف السنن ۱/۲۷۷
(۴) حوالہ سابق ۱/۲۷۸ (۵) درمختار مع الرد ۱/۲۱۰

اضطراری میں حرام چیز کی حرمت ختم ہوجاتی ہے(۱)، یہی رائے امام قرطبی مالکی کی بھی ہے(۲)۔ شافعیہ کے یہاں خالص شراب بطور دوا حرام ہے، لیکن مخلوط ہو تو بہ ضرورت علاج کی گنجائش ہے، بشرطیکہ اس کے سوا پاک دوا موجود نہ ہو۔ یہی حکم شراب کے علاوہ دیگر نجس چیزوں کا بھی ہے کہ اگر مخلوط ہوں تو بطور علاج درست ہے۔(۳)

البتہ یہ ذہن نشین رہے کہ یہ حکم بدرجہ مجبوری ہے، اس لیے بدرجہ مجبوری، ناپسندیدگی کے ساتھ ہی اسے گوارا کرنا چاہیے اور ساتھ ہی مسلم ڈاکٹروں کی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری ہے کہ وہ حرام دواؤں کا متبادل دریافت کریں۔ نیز ماہر اور خداترس ڈاکٹر کے مشورے کے بعد ہی ایسی دواؤں کا استعمال کرنا چاہیے۔

زہر سے علاج

زہر حرام ہے، لیکن حرمت کی وجہ یہ ہے کہ انسانی جان اس سے ہلاک اور ضائع ہوجاتی ہے، لہٰذا اگر زہر خورانی سے مقصود علاج ہو، کسی انسانی جان کو بچانا ہو تو اب اس کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں۔ علامہ شوکانی رقم طراز ہیں:

> ''ماوردی اور دوسرے لوگوں نے کہا ہے کہ زہر کی چند قسمیں ہیں؛ کچھ وہ ہیں جن کی زیادہ اور کم مقدار ہلاک کردیتی ہے، ایسے زہر کا استعمال دوا وغیرہ کے لیے درست نہیں، اس لیے قرآن میں ہے کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو" ولا تلقوا ایدیکم الی التھلکۃ "بعض وہ ہیں کہ ان کی زیادہ مقدار قاتل ہے مگر کم مقدار نہیں، ایسے زہر کا دوا وغیرہ کے لیے زیادہ مقدار میں استعمال حرام ہے، کم مقدار میں بغرض علاج جائز ہے۔ کچھ وہ ہیں کہ اکثر قاتل ثابت ہوتے ہیں اور کبھی نہیں بھی اور کبھی ہوسکتے ہیں تو اگر یہ بطور علاج استعمال کیا جائے تو جائز ہے، ورنہ نہیں۔'' (نیل الاوطار ۸/۲۰۴)

البتہ اگر وہ زہر کسی ناپاک چیز سے بنایا گیا ہو تو اب اس کا استعمال بدرجہ مجبوری ہی جائز ہوگا، ورنہ نہیں۔(۴)

(۱)احکام القرآن لابن العربی ۱/۵۶ (۲) تفسیر قرطبی ۲/۲۳۱ (۳)الفقہ علی المذاہب ۲/۸ (۴)یحرم شرب التریاق لنجاستہ الا اذا لم یقم غیرہ مقامہ التیسیر شرح الجامع الصغیر للمناوی ۲/۳۲۷

روزمرہ کے مسائل میں سلف صالحین کی احتیاط

حیات اللہ نعیم قاسمی☆

کامیاب انسان وہ ہے جو کسی خاردار راستے پر چلتا ہے تو اپنے کپڑوں کو سمیٹ کر کانٹوں سے بچتا بچاتا چلا جاتا ہے، ورنہ ذرا سی غفلت سے اس کے تلوے لہولہان ہوسکتے ہیں اور اس کا دامن کانٹوں سے الجھ کر تار تار ہوسکتا ہے۔ ویسے ہی دنیا و آخرت کی زندگی میں کامیاب انسان وہ سمجھا جاتا ہے جو حزم و احتیاط سے زندگی گزار کر اپنی کشتی پار لگالیتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے تو یہ چیز کچھ زیادہ ہی اہم ہے۔

حسن بصریؒ اپنی مجلس میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ایک چھوٹی سی بچی نے ایک بار بڑی قیمتی نصیحت کی۔ کسی نے پوچھا: حضرت کیا نصیحت کی؟ فرمایا: ایک مرتبہ بارش ہورہی تھی، کیچڑ تھا میں نے کہا بیٹی! احتیاط سے چلنا، کہیں پھسل نہ جانا، اس نے مجھے دیکھ کر کہا ''میں پھسل بھی گئی تو دوبارہ کھڑی ہوجاؤں گی، ذرا آپ پھسل نہ جانا۔ چنانچہ اس طرح اس بچی نے حسن بصریؒ کے بارے میں کہا کہ آپ مقتدا ہیں بالکل اسی طرح ہم مسلمان بحیثیت خیر امت تمام اقوام عالم کے مقتدا ہیں، ہمیں ہر معاملے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے اسلاف نے ایسی محتاط اور پاکیزہ زندگی گزاری جو رہتی دنیا تک کے لیے نظیر بن گئی۔ امام احمد بن حنبلؒ بہت بڑے امام اور محدث گزرے ہیں، ان کی کتاب ہے ''مسند احمد'' جس میں چالیس ہزار احادیث درج ہیں۔ آپ پر ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ حکومت کی طرف سے آپ کی خدمت میں بڑی بڑی رقمیں اور بے شمار دولت پیش کی گئی مگر آپ نے اس میں سے ایک پیسہ بھی لینا گوارا نہ کیا۔ محض اس اندیشے سے کہ پتہ نہیں بادشاہ نے اسے حلال طریقے سے حاصل کیا ہے یا حرام طریقے سے۔

ایک بار انہیں معلوم ہوا کہ ان کے لڑکے ''صالح'' شاہی عطیہ قبول کرتے ہیں، اسی دن سے ان کے گھر کی کوئی چیز استعمال نہیں کی۔ چنانچہ ایک دفعہ آپؒ کی طبیعت خراب ہوگئی،

☆ممبئی

حکیم نے انہیں بھنے ہوئے کدو کا پانی پینے کا حکم دیا، صالح کا چولہا گرم تھا لوگوں نے کہا کہ اس پر کدو بھون لیا جائے مگر انہوں نے انکار کر دیا اور فرمایا اس شخص کے گھر شاہی رقم آتی ہے اور اس رقم سے خریدی ہوئی چیزیں اس چولہے پر پکتی ہیں، اس لیے میں اس چولہے سے فائدہ اٹھانا پسند نہیں کرتا۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ ایک مشہور امام و محدث گزرے ہیں۔ ان کے والد ''مبارک'' کو ایک شخص نے ایک باغ کا نگہبان مقرر کیا، اس باغ میں ہر طرح کے میوے اور عمدہ عمدہ پھل تھے، مگر انہوں نے کبھی کسی درخت کا پھل نہیں چکھا۔

ایک دن باغ کے مالک نے ان سے کہا ''ایک کھٹا انار لے آؤ'' مبارک باغ سے ایک انار توڑ لائے، مالک نے چکھا تو وہ میٹھا نکلا، وہ مبارک پر ناراض ہو گیا اور کہا ''میں کھٹا انار مانگتا ہوں اور تم میٹھا انار لے آئے ہو، اتنے دن سے تم اس باغ میں رہتے ہو، تمہیں ابھی کھٹے اور میٹھے پھلوں کی تمیز نہیں ہوئی۔'' انہوں نے جواب دیا ''میٹھا اور کھٹا تو چکھنے سے معلوم ہوتا ہے اور میں نے آج تک کوئی پھل چکھا ہی نہیں تو میں کیا جانوں کہ کون سا پھل میٹھا ہے اور کون سا کھٹا ہے؟''

امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہؒ کا واقعہ ہے، ایک بار انہوں نے اپنے شریک تجارت کے پاس کپڑے کا ایک تھان بھیجا جو عیب دار تھا، اس سے کہلا دیا کہ بیچتے وقت گاہک سے اس کا پورا عیب بیان کر دینا، شریک نے اسے بیچ دیا مگر عیب بتانا بھول گیا اور یہ بھی اسے یاد نہ رہا کہ خریدار کون تھا؟ حضرت امام ابوحنیفہؒ کو جب اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے کپڑے کے تھان کی پوری قیمت صدقہ کر دی، جس کی مقدار تقریباً تیس ہزار درہم تھی اور اسی دن سے شریک تجارت سے قطع تعلق کر لیا۔ یہ ہوتی ہے سچے اہل ایمان کی حرارت ایمانی اور اکل حرام تو کجا مشتبہات سے بھی اجتناب کی کیفیت۔

اسی طرح ایک دن امام ابوحنیفہؒ کو ایک شخص کے دروازے پر دھوپ میں بیٹھا دیکھا گیا۔ کسی نے کہا ادھر سائے میں آ جاتے تو کیا حرج تھا؟ فرمایا: اس صاحب خانہ کے ذمہ میرے چند درہم قرض ہیں اور میں پسند نہیں کرتا کہ اس کے گھر کے سائے میں بیٹھوں اور نفع حاصل کروں۔

بہت دور ماضی بعید میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں، ماضی قریب میں خود ہمارے ملک ہندوستان میں کتنے سلف صالحین نے ایسی محتاط زندگیاں گزاری ہیں جو قابل رشک ہیں۔

ایک مرتبہ اشرف علی تھانویؒ سفر کرنے کے لیے اسٹیشن پہنچے اور سیدھے اس دفتر میں تشریف لے گئے، جہاں سامان کا وزن کرایا جاتا تھا۔ وہاں اتفاق سے ریلوے کا گارڈ کھڑا ہوا تھا جو حضرت والا کو پہچانتا تھا، وہ پوچھنے لگا کہ حضرت کیسے تشریف لائے؟ حضرت نے فرمایا کہ میں اپنے

سامان کا وزن کرانے آیا ہوں تاکہ اگر زیادہ ہو تو اس کا کرایہ ادا کر دوں۔ گارڈ نے کہا حضرت آپ وزن کرانے کے چکر میں کیوں پڑ رہے ہیں؟ آپ سامان کو وزن کرائے بغیر سفر کر لیں، میں آپ کے ساتھ ہوں اور میں اسی ٹرین میں گارڈ ہوں، آپ کو راستے میں کوئی نہیں پکڑے گا اور اگر سامان زیادہ بھی ہوا تو آپ سے کوئی شخص بھی جرمانے کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ حضرت نے اس گارڈ سے پوچھا کہ آپ کہاں تک میرے ساتھ جائیں گے؟ اس گارڈ نے جواب دیا کہ فلاں اسٹیشن تک جاؤں گا۔ حضرت نے پوچھا اس کے بعد پھر کیا ہوگا؟ اس نے کہا اس کے بعد جو گارڈ آئے گا میں اس سے کہہ دوں گا کہ ان کے سامان کا ذرا خیال رکھنا۔ حضرت والا نے پھر پوچھا کہ وہ گارڈ کہاں تک جائے گا؟ گارڈ نے جواب دیا کہ وہ گارڈ تو جہاں تک آپ کی منزل ہے وہاں تک آپ کے ساتھ ہی سفر کرے گا، اس لیے آپ کو کوئی خطرہ نہیں، حضرت والا نے فرمایا کہ مجھے تو اور بھی آگے جانا ہے۔ اس نے پوچھا کہ آگے کہاں جانا ہے؟ حضرت والا نے فرمایا کہ مجھے تو اس منزل سے بھی آگے اللہ تبارک و تعالیٰ کے پاس جانا ہے، وہاں کون گارڈ میرے ساتھ جائے گا جو مجھے اللہ کے سامنے سوال و جواب سے بچائے گا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ یہ ٹرین تمہاری ملکیت نہیں ہے، اس کے اوپر تمہارا اختیار نہیں ہے، تمہیں محکمے کی طرف سے اجازت نہیں ہے کہ تم کسی شخص کے زیادہ سامان کو کرایہ کے بغیر چھوڑ دو، لہٰذا میں تمہاری وجہ سے دنیاوی پکڑ سے ضرور بچ جاؤں گا، لیکن اس وقت جو چند پیسے میں بچالوں گا وہ میرے لیے حرام ہو جائیں گے، ان حرام پیسوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے سوال ہوگا تو وہاں پر کون گارڈ مجھ کو بچائے گا اور کون جواب دہی کرے گا۔ یہ باتیں سن کر گارڈ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور پھر آپ نے سامان وزن کرا کے اس کے زائد پیسے ادا کیے اور سفر پر روانہ ہو گئے۔

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت تھانویؒ بیمار ہوئے، اس دوران ایک صاحب نے آپ کو پینے کے لیے دودھ لا کر دیا، آپؒ نے دودھ پیا، اور تھوڑا سا دودھ بچ گیا، بچا ہوا دودھ آپ نے سرہانے کی طرف رکھ دیا، اتنے میں آپ کی آنکھ لگ گئی۔ جب بیدار ہوئے تو ایک صاحب جو پاس کھڑے تھے ان سے پوچھا کہ بھئی وہ تھوڑا سا دودھ بچ گیا تھا وہ کیا ہوا؟ ان صاحب نے کہا حضرت وہ تو پھینک دیا ایک گھونٹ ہی تھا، حضرت تھانویؒ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ تم نے اللہ کی اس نعمت کو پھینک دیا، تم نے بہت غلط کام کیا، اگر میں اس کو نہ پی سکا تو تم خود پی لیتے، کسی اور کو پلا دیتے، کسی بلی یا طوطے کو پلا دیتے، اللہ کی کسی مخلوق کے کام آ جاتا پھر ایک اصول بیان فرمایا کہ ''جن چیزوں کی زیادہ مقدار سے انسان اپنی عام زندگی میں فائدہ اٹھاتا ہے ان کی تھوڑی مقدار کی قدر اور تعظیم اس کے ذمہ واجب ہے۔''

یہ تھی روزمرہ کے مسائل میں احتیاط، کسب حلال کی فکر اور رزق خداوندی کی قدردانی کی ایک سبق آموز مثال جو ہم جیسے ناقدروں کے لیے چشم کشا بھی ہے اور مشعل راہ بھی۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح زہر ملے شہد کو کوئی شخص دانستہ طور پر پینے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوگا جبکہ شہد یقیناً ایک لذیذ اور مفید چیز ہے، اسی طرح روزمرہ کے مسائل میں بے احتیاطی سم قاتل سے کم نہیں، اس سے ہر ممکن بچنے کی کوشش کرنا انتہائی ضروری ہے۔

☆☆☆

کیا آپ فن لینڈ کے مسلمانوں سے واقف ہیں؟

فن لینڈ اپنی فطری اور قدرتی خوبصورتی کی بنا پر شمالی یورپ کا ایک مشہور ملک اور خطہ ہے، یہ ملک ہزاروں خوبصورت جزیروں سے مزین اور آراستہ ہے، یہ خطہ گھنے جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے، لمبے اور گہرے ساحل پر واقع ہے، اس کی چٹانیں مٹیالی، سرخ، چکنی، مختلف رنگ کی ہیں، یہاں تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ آدمی آباد ہیں، ان کی اکثریت ملک کے جنوب میں رہتی ہے، اس کا دارالسلطنت Helsinki ہے۔ جس کے باشندوں کی تعداد پچاس ہزار ہے۔

فن لینڈ کے حدود اربعہ کچھ اس طرح ہیں۔ مغرب میں روس سیاہ، مشرق میں روس اتحادی، جنوب میں خلیج فن لینڈ اور بوسینیا اور شمالی علاقہ قطب شمالی کے دامن میں واقع ہے۔

وہاں کے معاش کا دارومدار زیادہ تر لکڑی کے کاموں اور چائے کی پتیوں پر ہے۔

تاتاری فن لینڈیوں کا شمار وہاں کے قدیم مسلمانوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تعداد دسمبر ۱۹۸۸ء میں ۸۰۰-۱۰۰۰ تھی، جو اب تیس ہزار کے قریب ہوگئی ہے۔

فن لینڈ میں مختلف نسلوں کے مسلمان آباد ہیں، جن میں صومالی (۶۲۶۷) عرب عراقی (۲۵۹۹) کرد (۲۵۶۰) ایرانی (۱۶۵۸) ترک تاتاری (۱۳۵۷) البانی (۷۸۴) تھائی لینڈ (۱۶) اور دیگر (۵۲۲) ہیں۔

فن لینڈ کے معاشرہ اسلامی کے قائد و رہنما امام خضر شہاب، صدر الجمعیۃ الاسلامیہ فن لینڈ (نمائندہ نیشنل مسلم مہاجرین) عبدالحکیم آرارسی نائب صدر مجلس ادارہ الجمعیۃ الاسلامیہ فن لینڈ اور اوکان ضاہر صدر اسلامی اکیڈمی فن لینڈ (نمائندہ اقلیت تاتاری) ہیں۔ (اخلاق احمد کریمی)

ایک انوکھا مقدمہ

سعودی عرب کے شہر قصیم کی شرعی عدالت نے اپنی تاریخ میں ایسا عجیب وغریب مقدمہ دیکھا جو قصیم بلکہ پوری مملکت سعودی عرب میں نہ پہلے کبھی دیکھا یا سنا گیا تھا۔ ہم آئے دن خاندانی اختلافات، قطع رحمی اور عناد کی بھینٹ چڑھنے والے افسوسناک واقعات اور دلوں کو لرزا دینے والے واقعات دیکھتے ہی رہتے ہیں مگر صلہ رحمی کی بنیاد پر بننے والے اس مقدمہ کی تفاصیل پڑھیے اور اس واقعے کو کسوٹی بنا کر اپنے آپ کو یا اپنے گرد ونواح میں وقوع پذیر حالات وواقعات کو پرکھیے۔

اس شخص کا نام حیزان الفہیدی الحربی ہے۔ یہ بریدہ سے ۹۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں (اسیاح) کا رہنے والا ہے۔ قصیم کی شرعی عدالت میں فیصلہ جیسے ہی اس کے خلاف ہوا تو اس نے خود تو رو رو کر اپنی داڑھی کو آنسوؤں سے تربتر کیا ہی مگر اس کو دیکھنے والے لوگ بھی رو پڑے۔ آخر کس بات پر وہ زاروقطار رویا اور بے حال ہوا؟ اولاد کی بے رخی پر؟ خاندانی زمین سے بے دخلی پر؟ حیزان کی بیوی نے اس پر خلع کا دعویٰ کیا؟ نہیں، ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ تو پھر آخر کس بات کا رونا! یہ قصہ تصوراتی نہیں بلکہ سچا حقیقت پر مبنی ہے، جس کی تفاصیل سعودی عرب کے ایک بڑے اخبار ''الریاض'' کے سرورق پر چھپیں۔ مملکت کی کئی بڑی مساجد کے منابر سے ائمہ کرام نے اپنے خطابات میں اس واقعے کا ذکر کیا۔ سیکڑوں عربی ویب سائٹس اور فورمز پر لوگوں کی آنکھیں کھولنے والے اس واقعے کی تلخیص آپ کے لیے حاضر ہے۔

حیزان اپنی ماں کا بڑا بیٹا ہے، اکیلا ہونے کی وجہ سے سارا وقت اپنی ماں کی خدمت اور نگہداشت پر صرف کرتا تھا۔ حیزان کی ماں ایک بوڑھی اور لاچار عورت ہے جس کی کل ملکیت پیتل کی ایک انگوٹھی ہے، جسے بیچا جائے تو کوئی سو روپے بھی دینے پر نہ آمادہ ہو۔ سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا کہ ایک دن دوسرے شہر سے حیزان کے چھوٹے بھائی نے آکر مطالبہ کر ڈالا کہ میں ماں کو ساتھ لے کر جانا چاہتا ہوں تاکہ وہ شہر میں میرے خاندان کے ساتھ رہ سکے۔ حیزان کو اپنے چھوٹے بھائی کا اس طرح آکر ماں کو شہر لے جانے کا ارادہ بالکل پسند نہ آیا۔ اس نے اپنے بھائی کو سختی سے منع کیا کہ وہ ایسا

نہیں کرنے دے گا۔ ابھی اس کے اندر اتنی ہمت، سکت اور استطاعت ہے کہ وہ ماں کی مکمل دیکھ بھال اور خدمت کر سکے۔ دونوں بھائیوں کے درمیان تکرار زیادہ بڑھی تو انھوں نے معاملہ عدالت میں لے جانے کا فیصلہ کیا۔ مگر معاملہ عدالت میں جا کر بھی جوں کا توں ہی رہا۔ دونوں بھائی اپنے موقف سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ عدالت پیشیوں پر پیشیاں دیتی رہی تا کہ وہ دونوں کسی حتمی نتیجے پر پہنچ سکیں مگر یہ سب کچھ بے سود رہا۔ مقدمے کی طوالت سے تنگ آ کر قاضی نے آئندہ پیشی پر دونوں کو اپنی ماں کو ساتھ لے کر آنے کے لیے کہا تا کہ وہ ان کی ماں سے ہی رائے لے سکے کہ وہ کس کے ساتھ رہنا زیادہ پسند کرے گی؟ اگلی پیشی پر یہ دونوں بھائی اپنی ماں کو ساتھ لے کر آئے، ان کی ماں کیا تھی، محض ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ۔ جب قاضی نے ان کی ماں کو پیش ہونے کے لیے کہا تو وہ اسے ایک خالی کارٹن میں ڈال کر لائے۔ بڑھیا کا وزن بیس کلو بھی نہیں بنتا تھا۔ قاضی نے بڑھیا سے پوچھا کہ کیا وہ جانتی ہے کہ اس کے دونوں بیٹوں کے درمیان اس کی خدمت اور نگہداشت کے لیے تنازع چل رہا ہے؟ دونوں چاہتے ہیں کہ وہ اسے اپنے پاس رکھیں۔ ایسی صورتحال میں وہ کس کے پاس جا کر رہنا زیادہ پسند کرے گی؟ بڑھیا نے کہا، ہاں میں جانتی ہوں مگر میرے لیے کسی ایک کے ساتھ جا کر رہنے کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اگر حیزان میری ایک آنکھ کی مانند ہے تو اس کا چھوٹا بھائی میری دوسری آنکھ ہے۔ قاضی صاحب نے معاملے کو ختم کرنے کی خاطر حیزان کے چھوٹے بھائی کی مادی اور مالی حالت کو نظر میں رکھتے ہوئے مقدمے کا فیصلہ اس کے حق میں کر دیا۔

جی ہاں، تو یہ وجہ تھی حیزان کے اس طرح دھاڑیں مار مار کر رونے کی۔ کتنے قیمتی تھے حیزان کے یہ آنسو، حسرت کے آنسو، کہ وہ اپنی ماں کی خدمت کرنے پر قادر کیوں نہیں مانا گیا؟ اتنا عمر رسیدہ ہونے کے باوجود بھی ماں کی خدمت کرنے کو سعادت حاصل کرنے کے لیے یہ جدوجہد؟ شاید بات حیزان کی نہیں، بات تو ان والدین کی ہے جنھوں نے حیزان جیسے لوگوں کی تربیت کی اور انہیں برالوالدین کی اہمیت اور عظمت کا درس دیا۔ (ندائے خلافت)

☆☆☆

مجوسیت اور زرتشتیت (۱)

ابوارقم فلاحی☆

لفظ مجوس کی تحقیق

۱- مجوس فارسی زبان کا لفظ ہے۔ ابن منظور لکھتے ہیں:

"المجوس جيل معروف جمع واحدهم مجوسي وهو معرب "منج كوش" وكان رجلا صغيرالاذنين ، كان اول من دان بدين المجوس ودعاالناس اليه فعربت العرب۔" (ابن منظور، لسان العرب، مادہ مجوس)

مجوس معروف قوم ہے، یہ لفظ جمع ہے اور اس کا واحد مجوسی ہے، یہ معرب ہے اور اس کی اصل منج کوش ہے، یہ ایک آدمی تھا جس کے کان چھوٹے تھے اور یہ پہلا آدمی تھا جس نے مجوسی مذہب کو اختیار کیا اور لوگوں کو اسے اختیار کرنے کی دعوت دی، اس لفظ کو عرب نے معرب بنا لیا۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ "مجوس" ایک قبیلہ کا نام تھا جس کی جانب نسبت کر کے اس مذہب کو مجوسیت کہا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایک شخص کی صفت تھی جس کی جانب مجوسیت کی نسبت کی جاتی ہے۔ (الموسوعۃ المیسرۃ فی الادیان والفرق والمذاہب المعاصرۃ ج۲ ص۱۱۳۹)

۲- لفظ مجوس فارسی زبان ہی کا لفظ ہے، لیکن یہ اصلاً "موبد" کا معرب ہے، جو قدیم ترین زمانہ سے آج تک ایران کے دینی رہنماؤں کے لیے بولا جاتا رہا ہے۔ موبد کی اصل مغویت ہے اور یہ لفظ "مغ" کو وسعت دے کر بنایا گیا ہے۔ (اعلام القرآن، ڈاکٹر محمد، ص۵۳۰) انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں لفظ "میج" (Magic) مستعمل ہے، جس کے معنی جادو کے ہیں یہ بھی مجوس (مغ) ہی سے مستعار لیا گیا ہے کیونکہ مجوس جادو ٹوٹکے وغیرہ میں مشہور تھے، اس لیے یہ نام یوروپ میں جادو کے لیے بولا جانے لگا۔

۳- یہ لفظ حبشی ہے، حبشی زبان میں 'نکوس' کافر کو کہتے ہیں۔ لفظ مجوس اس 'نکوس' کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور عیسائی حبشیوں کے ذریعہ عرب تک پہونچا ہے۔ (فضل الرحمٰن ماہنامہ معارف، مارچ ۱۹۲۵ء اعظم گڑھ) لیکن اس رائے کی پشت پر مضبوط دلائل نہیں ہیں۔ (......جاری)

☆استاذ تفسیر وادیان جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

تعارف وتبصرہ

کتاب: ایمانی تقریریں   مرتب: شیخ شفیق احمد قاسمی   مبصر: اخلاق احمد کریمی قاسمی

ناشر : پیغام بک ڈپو، اردو بازار، جلال پور، امبیڈکر نگر

یہ حقیقت ہے کہ ''تبلیغی تحریک'' جس کی بنا حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ کے ہاتھوں پڑی اس قدر بارآور ثابت ہوئی کہ وہ علاقے جہاں کے معصوم بچے کلمہ اسلام سے ناآشنا، جوان مذہب بیزار اور بوڑھے اپنے دین سے بیگانہ تھے۔ ایسے لوگوں میں صرف اتنا ہی نہیں کہ اسلامی روح بیدار ہوئی بلکہ وہ ہادی اور راہبر کی صفوں میں کھڑے ہوگئے، ہاں جہاں جہاں علماء کرام کی رہبری اور رہنمائی نہیں ہے وہاں کچھ خامیاں بھی در آئی ہیں۔

اس تحریک کے فروغ کے لیے جہاں پر اور تگ ودو ہوتی رہی وہیں عمدہ وفیض رس کتابیں بھی تصنیف ہوئیں۔ اسی سلسلہ کی تازہ کڑی یہ کتاب ''ایمانی تقریریں'' بھی ہے، کتاب کے مرتب حضرت مولانا شفیق احمد صاحب قاسمی مدظلہٗ ہیں جو تبلیغی تحریک کے صرف گرم جوش رکن ہی نہیں بلکہ قلم کی دنیا سے بھی ان کا گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ اکابر کے افادات کو عام کرنے کے سلسلے میں کئی قابل قدر کتابیں مرتب کرچکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمت کو قبول فرمائے۔ آمین

۵۱۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۴۲ تقاریر کا مجموعہ ہے، مرتب کتاب نے اسے چار ابواب پر منقسم کیا ہے۔ پہلا باب 'عوام سے خطاب'، دوسرا باب 'علماء سے خطاب'، تیسرا باب 'طلبہ اور اسٹوڈنٹس سے خطاب' اور چوتھا باب 'خواتین سے خطاب' پہلے باب کے تحت ستائیس تقریریں ہیں، دوسرے باب میں تین تقریریں، تیسرے باب میں سات تقریریں اور چوتھے باب میں پانچ تقریریں ہیں۔

مرتب کا اسلوب بیان سہل اور شیریں ہے، قرآن وحدیث اور اسلاف کے واقعات سے ہر تقریر کو مزین کیا گیا ہے، تبلیغی تحریک میں رائج امور اور دیگر طریقۂ کار کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، محترم مرتب کی کوشش قابل ستائش ہے۔ لیکن ایک کمی ہے جس کا ازالہ ضروری ہے کہ ہر منقول کو مرتب نے مکتوب کی شکل دے دی ہے جب کہ لکھنے اور بولنے والوں کے سامنے یہ اصول رہے کہ ''ہر مکتوب نہ منقول ہونا چاہیے اور نہ ہر منقول مکتوب ہونا چاہیے'' تو بہت سارے اشکالات کو دور کیا جاسکتا ہے اور قائل کی مراد کو نہ سمجھنے کی وجہ سے جو غلط فہمی ہوتی ہے اس کا ازالہ ہوسکتا ہے۔

بہرحال مرتب کی کوشش قابل صد تحسین ولائق صد تبریک ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب عام مسلمانوں کے لیے عموماً اور تبلیغی حلقوں کے لیے خصوصاً نافع ثابت ہوگی۔ ☆☆☆

جامعہ کے لیل ونہار

عبدالرقیب فلاحی

شیخ مسلم الزامل کا خطاب

جناب شیخ مسلم الزامل (کویت) نے ۲۰۱۲/۳/۳۱ء کو طلبہ واساتذہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم میں سے ہر شخص قرآن مجید کا عملی مجسمہ بن جائے تاکہ فریضۂ دعوت کو ہم بحسن وخوبی انجام دے سکیں۔

آپ نے صداقت وامانت، سیرت وکردار کی بلندی اور سماج ومعاشرے کی خدمت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ یہی چیزیں دعوت دین کو ثمرآور بنائیں گی۔

شیخ عبدالحمید جاسم البلالی کا خطاب

یکم اپریل بروز یکشنبہ کو شیخ عبدالحمید جاسم البلالی صاحب نے کلیۃ الدعوۃ میں بعد نماز مغرب اساتذہ جامعہ کو خطاب کرتے ہوئے ''مثالی معلم'' کی اہم ترین صفات کا تذکرہ فرمایا۔ آپ نے فرمایا کہ ایک مثالی معلم میں درج ذیل صفات کا پایا جانا انتہائی ضروری ہے:

(۱) وہ اپنے دین کا کامل نمونہ ہو۔ (۲) فن تدریس میں وہ مخلص اور حسبۃً للہ یہ کام کررہا ہو (۳) لوگوں کی اصلاح سے قطعی مایوس نہ ہو۔ (۴) حصول علم کا سلسلہ کبھی بھی منقطع نہ کرے۔

شیخ الجامعہ کا خطاب

۸/اپریل بعد نماز فجر جامعہ کی مسجد میں امیر جماعت اسلامی ہند نے دعوت دین اور اس کی ضرورت واہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: ہم جس ملک میں رہتے ہیں اس میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں سال سے خالق کائنات کی طرف سے کسی نبی کو مبعوث نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے یہ ملک گوناگوں مسائل کا شکار ہے اور اس کے باشندے اپنے حال ومستقبل کو لے کر پریشان اور فکرمند ہیں ایسے میں امت محمدیہ کے افراد کی ذمہ داری بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ محمد عربی ﷺ کے اسوہ پر عمل کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ اس ملک کے مسلمان باشندے اسی دلسوزی، تڑپ اور لگن وحوصلے کے ساتھ دعوت کا کام کریں جس کے ساتھ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے کیا تھا، اس سے نہ صرف اس ملک کی

پریشانیاں ختم ہوں گی بلکہ ملت کے بے شمار مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔

جمعیۃ الطلبہ کی جانب سے دوروزہ سیمینار کا انعقاد

جمعیۃ الطلبہ جامعۃ الفلاح کی جانب سے ''تحریکات اسلامی اور خدمت حدیث برصغیر کے تناظر میں'' کے عنوان پر ۲-۳ر مئی کو ابواللیث ہال میں ایک اہم سیمینار کا انعقاد ہوا، سیمینار کا آغاز بعد نماز مغرب میر ابن السبیل کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔ استقبالیہ سکریٹری جمعیۃ الطلبہ محمد ثاقب اور افتتاحی کلمات صدر مدرس مولانا انیس احمد مدنی نے پیش کیے۔ اس سیشن میں کل دو مقالے پیش کیے گئے۔ عبدالمتین (عربی پنجم) نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پر اور انس انور (عربی ہفتم) نے معارف الحدیث-ایک جائزہ کے عنوان پر مقالہ پڑھا، صدارت کے فرائض مولانا ولی اللہ مجید قاسمی صاحب نے انجام دیے، نظامت افضل حسین نے کی۔

دوسرے سیشن کا آغاز محمد ابراہیم (عربی پنجم) کی تلاوت سے ہوا، اس سیشن میں کل سات مقالات پڑھے گئے، عدنان اطہر (عربی پنجم) نے علامہ عبدالحق محدث دہلوی پر، ایوب کشمیری (عربی ششم) نے علامہ انور شاہ کشمیری پر، محمد شاداب نے مولانا زکریا کاندھلوی پر، ابوطاہر (عربی پنجم) نے شیخ نذیر حسین پر، محمد اکمل (عربی ششم) نے شمس الحق عظیم آبادی پر، عمار احسن (عربی چہارم) نے عبدالرحمٰن مبارکپوری پر، توصیف التمش نے حبیب الرحمٰن اعظمی پر اور نعمان قطب (عربی چہارم) نے مولانا صدیق حسن بھوپالی کی حیات وخدمات پر مقالے پڑھے۔ اس سیشن کی صدارت ناظم جامعہ جناب مولانا محمد طاہر مدنی نے کی۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ قرآن وحدیث دونوں کو ساتھ رکھنا چاہیے، کسی مسئلے کے حل کے لیے قرآن وحدیث دونوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

تیسرے سیشن کا آغاز محمد ابراہیم کی نظم سے ہوا، اس کی صدارت مولانا نعیم الدین صاحب اصلاحی نے کی۔ پہلا مقالہ فیصل نفیس (عربی پنجم) نے مولانا شبیر احمد عثمانی پر پڑھا، شیخ عظیم الدین (عربی ششم) نے مولانا جلیل احسن ندوی مرحوم پر، عبدالقوی عادل نے مولانا امین احسن اصلاحی پر، عبدالرحمٰن طاہر (عربی پنجم) نے شاہ اسماعیل شہید پر، اسامہ عظیم نے عبدالعزیز محدث دہلوی پر اور فرحان اجمل (عربی ششم) نے علامہ محمد طاہر پٹنی پر مقالات پڑھے۔

سیمینار کا اختتامی سیشن ۳ر مئی کو بعد نماز مغرب حافظ عبدالرقیب فلاحی اور ڈاکٹر محمد آصف کی نظم کے ذریعہ ہوا، اس سیشن میں کل تین مقالے پیش ہوئے، صدارت مولانا مقبول احمد صاحب فلاحی نائب ناظم جامعہ نے کی۔ شاہد حبیب نے جامعۃ الفلاح اور خدمت حدیث پر، عبداللہ حنیف

نے دارالعلوم دیوبند اور خدمت حدیث پر، اور عامر مظفر نے ندوۃ العلماء اور خدمت حدیث کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ نائب ناظم جامعہ نے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ آج ہمیں کسی ایک فن میں ماہر ہونا چاہیے کیونکہ موجودہ دور اختصاص کا دور ہے۔ نگراں جمعیۃ الطلبہ مولانا محمد اسماعیل فلاحی اور مہتمم تعلیم وتربیت مولانا رحمت اللہ الاثری نے آخر میں اپنی قیمتی نصیحتوں سے طلبہ کو مستفید کیا۔ یہ سیمینار سکریٹری جمعیۃ الطلبہ محمد ثاقب فلاحی کے کلمات تشکر پر اختتام پذیر ہوا۔

جمعیۃ الطلبہ کا سالانہ تعلیمی مظاہرہ

جمعیۃ الطلبہ کے زیر انتظام سالانہ تعلیمی مظاہرہ کا آغاز ۳۱ر مئی کو ابواللیث ہال میں ۸ بجے طارق انور کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا، اور ترانہ جامعہ طارق انور و محمد داؤد (عربی ہفتم) نے پیش کیا۔ بعدازیں نگراں جمعیۃ الطلبہ نے افتتاحی کلمات پیش کیے۔ جمعیۃ کے سکریٹری محمد ثاقب نے سالانہ رپورٹ پیش کی۔ اس موقع پر عبدالرحیم (عربی سوم)، محمد نہال (عربی چہارم)، محمد رافع (درجہ ہفتم) نے تقریریں پیش کیں اور سید طلحہ (عربی اول) نے انگریزی، عبدالمتین نے ہندی زبان میں تقریریں پیش کیں۔ جس کی نظامت کے فرائض محمد عاصم (عربی ہفتم) نے انجام دیے۔ اسی طرح دوسرے سیشن کی صدارت مولانا مقبول احمد فلاحی (نائب ناظم) نے کی۔ بعدازیں منعقد ہونے والے تیسرے سیشن کی افتتاحی تقریر مولانا عبدالعظیم فلاحی نے ''دہشت گردی اور اسلام'' کے زیر عنوان کرتے ہوئے کہا کہ پوری دنیا میں دشمنان اسلام مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے نئے حربے استعمال کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو تہہ وبالا کرنے کے لیے انھیں دہشت گرد ثابت کیا جا رہا ہے لیکن ہماری تاریخ گواہ ہے کہ ہم ہمیشہ امن وامان کے علم بردار رہے ہیں۔ بعدازیں ناظم جامعہ مولانا محمد طاہر مدنی نے ''کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی'' کے عنوان پر ایک پر مغز تقریر کی۔

اس پروگرام کا چوتھا اور آخری سیشن بعد نماز عشاء ہوا جس کی شروعات محمد ابراہیم (عربی اول) کی نظم سے ہوئی، نورالقمر (عربی چہارم) نے بعنوان اتحاد واتفاق ایک تقریر پیش کی، جس میں مقرر نے اتحاد کی اہمیت کو بحسن وخوبی بیان کیا، اس کے بعد ڈرامہ ''جیسی کرنی ویسی بھرنی'' پیش کیا گیا۔

آخری میں ڈرامہ بہ عنوان ''توہم پرستی کا نتیجہ'' پیش کیا گیا، اس کے بعد تمثیلی مشاعرہ پیش کیا گیا۔ اس طرح شب کے تقریباً ایک بجے تک چلنے والے اس پروگرام کی نظامت کے فرائض عبداللہ حنیف (عربی ہفتم) نے انجام دیے۔ اس موقع پر جامعہ کے طلبہ واساتذہ سمیت علاقے کے معززین کی بڑی تعداد موجود تھی۔

اظہار تعزیت

یہ خبر ہمدردان جامعہ کے لیے بے حد باعث رنج وغم ہوگی کہ ہیڈ معلّمہ شعبۂ اعلیٰ محترمہ آسیہ فلاحی صاحبہ کے والد محترم جناب عبدالظاہر صاحب ۱۶/مارچ بروز جمعہ حرکت قلب کے بند ہوجانے کی وجہ سے اس دارفانی سے کوچ کرگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ نماز جنازہ جناب مولانا کمال الدین صاحب نے پڑھائی اور جنازے میں ایک جم غفیر نے شرکت کی۔

ادارہ 'حیات نو' پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور خدا سے دعا گو ہے کہ وہ مرحوم کی مغفرت فرمائے، انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔

کلیۃ البنات کے شب و روز

۱۶/فروری ۲۰۱۲ء بروز جمعرات کو کلیۃ البنات (شعبۂ اعلیٰ) میں طالبات کے درمیان مسابقہ درس قرآن ہوا، جس میں ۱۹/طالبات نے حصہ لیا۔

۱۸/فروری ۲۰۱۲ء بروز سنیچر تقریب تقسیم انعامات منعقد ہوئی، پروگرام کا آغاز صالحہ عبدالمنان (عربی پنجم) کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔

بعدہٗ محترمہ صدر معلّمہ صاحبہ (شعبہ اعلیٰ) نے صدارتی کلمات سے نوازا، انھوں نے کہا کہ قرآن ہی ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں ''ذلک الکتاب لاریب فیہ'' اور یہ صرف ھدیً للمتقین ہی نہیں بلکہ ''ھدی للناس'' بھی ہے۔ اس لیے اس پر زیادہ سے زیادہ غور وفکر کرنے اور گہرائی میں اترنے کی ضرورت ہے۔

جناب مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب (استاذ تفسیر) نے ''القرآن انسٹی ٹیوٹ'' کی جانب سے ہونے والی تمام سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے طالبات کو اپنے اندر قرآن فہمی کی صفت پیدا کرنے کی ترغیب دلائی۔

اس کے بعد جناب محترم مولانا رحمت اللہ اثری صاحب (مہتمم جامعہ) محترمہ ساجدہ فلاحی صاحبہ (معاون مہتمم) محترمہ آسیہ فلاحی صاحبہ (صدر معلّمہ شعبہ اعلیٰ) جناب مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب (استاذ تفسیر) کے بدست مسابقہ میں شامل طالبات میں سے مرویٰ سبحانی (فضیلت ثالثہ) ا، صوفیہ ارشد (فضیلت اولیٰ) اا، اور ثمرہ یعقوب (عربی پنجم) کو ااا، انعامات سے نوازا گیا۔ نیز تمام شریک طالبات کو تشجیعی انعامات دیے گئے۔

تقسیم انعامات کے بعد جناب محترم مولانا رحمت اللہ اثری صاحب (مہتمم جامعۃ الفلاح) نے طالبات کو اپنے اندر تفسیری صلاحیت پیدا کرنے پر ابھارا۔ نیز انھوں نے فرمایا۔

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

آخر میں جناب محترم ڈاکٹر سکندر اصلاحی صاحب نے مسابقہ درس قرآن کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی۔ نیز قرآن کے پیغام کو مسلمین وغیر مسلمین میں عام کرنے کے لیے تیاری کرنے اور ان تک پہنچانے کو لازم قرار دیا۔

محترمہ آسیہ فلاحی صاحبہ (صدر معلّمہ) کے کلماتِ تشکر پر اس پروگرام کا اختتام ہوا۔

محسنین جامعہ متوجہ ہوں

جامعہ اس مادی دور میں طلبہ وطالبات کی تعلیم وتربیت کا جو اہم کام انجام دے رہا ہے، اس کی اہمیت وافادیت مسلّم ہے۔ دینی علوم کے ساتھ عصری علوم سے واقفیت، وسعت قلب ونظر کے ساتھ ملک وملت کی خدمت کے لیے افراد تیار کرنا، دعوتی واصلاحی جذبہ پیدا کرنا اور طالبات کی بھی اعلیٰ تعلیم کا نظم جامعہ کی اہم خصوصیات ہیں۔ خدمت خلق کے لیے ایک اسپتال اور فنی ٹریننگ کے لیے ایک ٹیکنیکل شعبہ بھی جامعہ میں قائم ہوا ہے۔ طلبہ وطالبات کی تعداد چار ہزار سے متجاوز ہے اور اساتذہ وکارکنان ۲۵۰ ہیں۔ وسائل کی قلت کی وجہ سے کئی منصوبے تشنہ تکمیل ہیں اور سالانہ بجٹ خسارے سے دوچار ہے۔ محسنین جامعہ اور اہل خیر حضرات سے اپیل ہے کہ بیش از بیش تعاون کے ذریعہ جامعہ کے وسائل کو مضبوط کریں اور اوقاف کے قیام میں بھی حصہ لے کر صدقہ جاریہ کا سامان کریں۔ جامعہ کے نمائندے ماہِ رمضان میں مختلف مقامات پر پہنچیں گے۔ اگر کہیں کوئی نہ پہنچ سکے تو براہ راست ڈرافٹ یا چیک کے ذریعہ اپنا تعاون منتقل کرکے اطلاع دینے کی زحمت کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی وناصر ہو۔

فہرست وفود برائے وصولی رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ

۱	ماسٹر محمد خالد صاحب ماسٹر سراج احمد صاحب	ممبئی، مدن پورہ، بائی کلہ، بھنڈی بازار، قلابہ، ڈونگری، دادر، کماٹی پورہ، گرانٹ روڈ، جے جے، بوری بندر وغیرہ

۲	ماسٹر شاہنواز احمد صاحب مولوی شاہد الاسلام فلاحی	ممبئی، رے روڈ، ولے پارلے، دھاراوی، سائن، باندرہ، سانتا کروز، ماہم، اندھیری، گورے گاؤں، کاندیولی، گنیش نگر، ملاڈ، جوگیشوری، بوری ویلی
۳	مولانا افتخار الحسن صاحب معین الدین فلاحی	ممبئی، ساکی ناکہ، کرلہ، گھاٹ کوپر، وکرولی، بھانڈوپ، گونڈی، چمبور، مرول ناکہ، شیواجی نگر، بیگن واڑی وغیرہ
۴	مولانا کمال الدین فلاحی ماسٹر رضی احمد صاحب	ممبئی، میرا روڈ، وسئی، نالہ سپارا، ملت نگر، دادر اور متفرقات
۵	مولوی عرفان احمد فلاحی ماسٹر ریاض احمد صاحب	بھیونڈی مغرب وغیرہ بھیونڈی مشرق کلیان وغیرہ
۶	ماسٹر محمد خالد حنیف	ممبئی، کوسہ، ممبرا، ناسک، پونہ وغیرہ
۷	محمد آصف فلاحی صاحب مولوی نسیم احمد فلاحی	بھساول، مالے گاؤں، کھام گاؤں، جل گاؤں، فیض پور، اورنگ آباد، جالنہ وغیرہ
۸	ماسٹر حبیب احمد صاحب ماسٹر جاوید احمد صاحب	احمد آباد، سورت، واپی، بڑودہ یارڈی، بلساڈ وغیرہ
۹	ماسٹر محمد ابراہیم صدیقی، ماسٹر عبدالمومن صاحب، محمد شمیم غازیپوری	بنگلور، ہاسن، بھٹکل، اڑپی، ملپے وغیرہ
۱۰	مشتاق احمد صاحب مولانا ثاقب علی قاسمی صاحب	مدراس وغیرہ
۱۱	مولانا اخلاق احمد کریمی قاری کوثر جمال صاحب	حیدرآباد، سکندرآباد، نظام آباد وغیرہ
۱۲	مولوی اقرار علی صاحب جاوید اقبال صاحب	بھوپال، ناگپور، چھندواڑا، سیونی وغیرہ
۱۳	ماسٹر نظام الدین صاحب ماسٹر معین الدین صاحب	راجستھان، جے پور، کوٹہ، باراں، مانگرول، سنکیت، بھٹیر، گنگاپور وغیرہ

۱۴	ماسٹر توفیق احمد صاحب مولانا جمیل احمد فلاحی مولانا مطیع اللہ فلاحی	دہلی، غازی آباد، میرٹھ، ہاپوڑ وغیرہ دہلی، سہارنپور، دہرادون، مظفرنگر، کیرانہ، بدایوں، پیلی بھیت، مرادآباد، سنبھل وغیرہ
۱۵	مولانا محمد اسماعیل فلاحی، مولانا اعجاز احمد قاسمی، عبدالرقیب فلاحی	پٹنہ، آرا، سیوان، مظفرپور، بہار شریف وغیرہ
۱۶	قاری محمد مصطفےٰ فلاحی، اقبال احمد اصلاحی	کلکتہ
۱۷	ماسٹر عبدالمالک صاحب صغیر احمد صاحب	ہنگائی پور، علاؤالدین پٹی، جگمل پور، نصیر پور، گلواں، جیراجپور، بندول، سکندرپور، سریاں، مہراج گنج وغیرہ
۱۸	حافظ ارشاد احمد صاحب	درجی، مدھناپار، ٹکریا وغیرہ
۱۹	مولانا ولی اللہ مجید قاسمی مولانا رئیس احمد فلاحی صاحب	علاقہ کشمیر
۲۰	ماسٹر کفیل احمد صاحب، ماسٹر اظفر عزیر صاحب، مولانا محمد عمران فلاحی، قاری زبیر احمد صاحب	بلریاگنج، شہاب الدین پور، بھگت پور وغیرہ
۲۱	منشی ریاض الدین	بھدوہی، سرائے میر، پھولپور، مرزاپور، الہ آباد وغیرہ
۲۲	مولانا احسان الحق فلاحی صاحب	اندور، اجین، دیواس وغیرہ
۲۳	منشی محمد سہیل صاحب عبداللہ صاحب	بنارس، رامپور، بریلی، علی گڑھ، نینی تال، کانپور، لکھنؤ وغیرہ
۲۴	ماسٹر سید عبداللہ صاحب ماسٹر شاہ عالم جونیئر، ابوذر صاحب	شہر اعظم گڑھ، مبارکپور، مئو وغیرہ
۲۵	محمد رضا انور صاحب حافظ محمد شمیم صاحب	گورکھپور، بستی، دیوریا، بلرامپور، گونڈا، فیض آباد، سلطانپور، بسکھاری، ٹانڈا، مچھلی شہر، جونپور، جلال پور
۲۶	محمد یعقوب صاحب	مئو، کوپاگنج، محمد آباد، مبارکپور، خیرآباد، بندی کلاں

نوٹ: افراد اور مقامات میں جزوی تبدیلی ہوسکتی ہے۔

روداد انجمن

انجمن طلبۂ قدیم قطریونٹ کی روٹینی میٹنگ

اللہ کے فضل وکرم سے تین ماہ کے بعد ایک بار پھر فلاحی برادران کی روٹینی میٹنگ برادر محترم جناب محمد اکرم فلاحی کی زیرصدارت بتاریخ ۸/۶/۲۰۱۲ء بروز جمعہ بعد نماز عشاء بمقام مرکز حلقہ رفقاء ہند مدینہ خلیفہ دوحہ قطر منعقد ہوئی۔

میٹنگ کا آغاز برادر نعیم اختر نیپالی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ آپ نے سورہ فرقان کے آخری رکوع کی چند آیتوں کی تلاوت وترجمہ پیش کیا۔ بعد ازاں فیاض احمد فلاحی نے ایک مختصر تذکیر کی اور دنیا کی زندگی کی حقیقت اور آخرت میں حساب وکتاب اور انفاق فی سبیل اللہ پر روشنی ڈالی۔ تعلق باللہ اور قرآن کریم سے رشتہ مضبوط کرنے کی طرف توجہ دلائی نیز ان اوصاف کو اپنے اندر پیدا کرنے پر توجہ دلائی جنھیں قرآن مومنوں کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو ویسے ہی بننے کی توفیق عنایت فرمائے۔

بعد ازاں سکریٹری یونٹ نے دوحہ قطر میں نئے آنے والے بھائی ڈاکٹر عبدالوحید فلاحی کو خوش آمدید کہا اور استقبالیہ کلمات کہے، اللہ تعالیٰ ان کو دین ودنیا دونوں میں خیر وبرکت عطا فرمائے آمین۔ نیز ایک اور خوشی کی بات کا اعلان کیا کہ برادرم رضوان احمد فلاحی نیپالی کے یہاں بیٹے کی ولادت ہوئی ہے ان کو تمام فلاحی برادران کی طرف سے مبارک باد پیش کی گئی۔

میٹنگ میں جن باتوں پر غور ہوا وہ اس طرح سے ہیں:

☆ جشن طلائی کے لیے تعاون

☆ ماہانہ تعاون کی پابندی سے ادائیگی۔

☆ حیات نو کے تعاون کو جاری کرنا۔

☆ حیات نو اساتذہ نمبر کے لیے مضامین۔

جشن طلائی کے لیے فلاحی برادران کا تعاون کتنا ہو اس پر شرکاء میٹنگ نے اپنی اپنی رائیں پیش کیں۔ قطر سے مطلوبہ مبلغ جو کہ پانچ لاکھ ہے، اس پر شرکاء نے طے کیا کہ یہ رقم متعین کرنے کے بجائے ہم لوگ کوشش کریں گے کہ زیادہ سے زیادہ تعاون جمع کریں اور جو اکٹھا ہو جائے اس کو بھیج دیا جائے اور یہ کام رمضان المبارک سے پہلے پہلے مکمل کرلیا جائے۔ فلاحی برادران کی اپنی اپنی استطاعت پر تعاون کو چھوڑ دیا جائے وہ اپنی وسعت کے مطابق ادا کریں۔ خازن برادرم افضال

احسن فلاحی کے پاس لوگ اپنی اعانتیں جمع کرادیں۔ ماہانہ اعانتوں کو جمع کرنے کے لیے گروپ لیڈر اپنے گروپ والوں سے وصول کرلیا کریں۔

بعد ازاں جامعۃ الفلاح کے ایک سابق استاذ اور خبیب کاظمی کے والد محترم نے اپنے احساسات وخیالات پیش کیے، انھوں نے نہایت مسرت کا اظہار کیا کہ وہ آج فلاحی برادران کے درمیان بیٹھے ہوئے ہیں نیز یہ کہ آپ فلاحی بھائی مادر علمی کے لیے بیٹھتے اور غور وفکر کرتے ہیں، اس سے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں نے جامعۃ الفلاح میں اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد تقریباً پونے دو سال تدریس کے فرائض انجام دیے لیکن اپنی خرابی صحت کے باعث مزید خدمت نہ کرسکا۔ البتہ وہ مدت جو جامعہ میں گزری وہ میرے لیے بڑی یادگار اور سنہرے لمحات تھے۔ مزید انھوں نے تحریک اسلامی سے اپنے تعلق کے بارے میں بتایا کہ میں فکری طور سے جماعت سے ہمیشہ وابستہ رہا۔ البتہ اپنی بعض مجبوریوں کے باعث رکن نہ بن سکا۔ اخیر میں انھوں نے اپنے لیے خیر وعافیت کی دعا کرنے کی درخواست کی۔

رمضان المبارک کے موقع پر گرمی کی چھٹی کی مناسبت سے صدر یونٹ محمد اکرم فلاحی صاحب چونکہ ہندوستان جارہے ہیں اس لیے دو ماہ تک ان کے غائبانہ میں قائم مقام صدر کے لیے برادرم آزاد اقبال فلاحی صاحب کو تمام شرکاء نے اتفاق رائے سے منتخب کیا۔ ان شاء اللہ وہ صدر محترم کی عدم موجودگی میں قطر یونٹ کے سارے کاموں کو سنبھالیں گے۔

اخیر میں صدر یونٹ برادر محترم محمد اکرم فلاحی صاحب نے اختتامی کلمات رکھے اور لوگوں سے گولڈن جوبلی کے لیے بڑھ چڑھ کر تعاون پیش کرنے کی گزارش کی اور ماہانہ تعاون پابندی سے ادا کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ نیز میٹنگوں میں پابندی سے شرکت کرتے رہنے کی تاکید کی۔

میٹنگ کے اختتام کا اعلان کرتے ہوئے شرکاء کو حیات نو کا تازہ شمارہ اپریل تا جون ۲۰۱۲ء تقسیم کیا گیا۔ نیز گولڈن جوبلی کا فولڈر اور قطر میں مقیم فلاحی برادران کی تازہ فہرست بھی دی گئی جس میں ان کے فون نمبر بھی درج ہیں۔ دعا کفارہ مجلس پڑھتے ہوئے میٹنگ کا اختتام ہوا اور اخیر میں سب نے ساتھ مل کر کھانا کھایا اور رخصت ہوئے۔

فیاض احمد فلاحی

سکریٹری قطر یونٹ

☆☆☆